۷۸۶

۱۱۰-۹۲

یا صاحب الزماں ادرکنی

DvD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

NOT FOR COMMERCIAL USE

www.ziaraat.com

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

Presented by www.ziaraat.com

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

Presented by www.ziaraat.com

الخلفاء

حصہ اوّل

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب

المرتضیٰ کا مسکت جواب

فروغ کاظمی

Presented by www.ziaraat.com

جملہ حقوق بہ حق مؤلف وناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : الخلفاء
مولف : فروغ کاظمی
تعداد اشاعت : ایک ہزار
سن اشاعت : دسمبر ۱۹۹۶ء
طباعت : سرفراز پریس، لکھنؤ ۳
قیمت : چالیس روپئے
ناشر : ادارہ تہذیب وادب ۳۹۲/۸ میدان ایل ایچ خاں جگنی لین، لکھنؤ ۳

ملنے کا پتہ

عباس بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ ۳

فون دوکان :- 260756 فون رہائش گاہ :
269598

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اس مظلوم شہزادے کے نام

جو ضربِ عمری کا شکار ہو کر

بطنِ مادر میں شہید ہو گیا

فروغ کاظمی

Presented by www.ziaraat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ
عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ

امّا بعد

اس
کتاب
کی
تالیف کا مقصد
کسی مسلمان کی دل آزاری نہیں

بلکہ
میرے مخاطب
صرف ابوالحسن ندوی اور وہابی مسلک کے افراد ہیں

اور
میری یہ کتاب
مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ کے جواب میں ہے۔

فروغ کاظمی

انڈکس

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۱	پیشہ	۴۳
اہم گفتگو	۹	نفع خوری	۴۴
		شراب نوشی	۴۴
باب اوّل ۔ ابوبکر بن قحافہ		ابوبکر کا مسلمان ہونا	۴۴
		صدیق اکبر کون ؟	۵۱
شجرہ	۳۰	ابوبکر، پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں	۵۲
قریش کون ؟	۳۱	ابوبکر کا شیطانی ایمان	۵۳
ابوبکر خلیفہ تھے یا خالفہ !	۳۷	ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت	۵۵
پیدائش	۳۷	ابوبکر کی معزولی	۵۸
ابوبکر کی وجہ تسمیہ اور نام	۳۸	غارِ ثور میں ابوبکر کا گریہ	۶۱
حلیہ	۳۹	غارِ ثور کی نوعیت	۶۷
ابتدائی زندگی	۳۹	غزوات سے کنارہ کشی اور فرار	۶۷
والدین	۴۰	جنگ بدر	۶۹
تعلیم	۴۰	جنگ احد	۷۱

Presented by www.ziaraat.com

جنگ خندق	۷۲
جنگ خیبر	۷۵
جنگ حنین	۷۹
صلح حدیبیہ اور ابو بکر کی گالیاں	۸۱
ابو بکر سے رسولؐ اللہ کی بیزاری	۸۳
رسولؐ اللہ کی شہادت	۸۴
سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت	۹۲
سقیفہ کی کارروائی	۹۴
خلیفہ کی ضرورت اور تقرری	۹۷
دھما چوکڑی	۱۰۳
خالد بن ولید کے مظالم	۱۰۴
فدک پر قبضہ	۱۰۷
فدک کی حقیقت	۱۱۰
ابو بکر سے سیدہ فاطمہؑ کی ناراضگی	۱۱۵
سیدہ کونین حضرت فاطمہ زہراؑ کی رحلت	۱۲۰
حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبرؐ اسلام کی نظر میں	۱۲۳
خلافت کی واپسی	۱۲۵
واقعۂ قرطاس	۱۲۷
انتقال	۱۳۱
مدفن	۱۳۱
حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے لیے تلوار نہ اٹھانے کا سبب	۱۳۳

باب ثانی

بنی ہاشم	۱۳۸
حضرت عبد المطلبؑ	۱۴۳
حضرت ابو طالبؑ	۱۵۰
حضرت طالبؑ	۱۶۲
مولود کعبہ، حضرت علی علیہ السلام	۱۶۴

باب ثالث۔ عمر بن الخطاب

پیدائش	۱۷۸
نام، کنیت اور القاب	۱۷۹
حلیہ	۱۸۰
والدین اور نسب	۱۸۲
ابتدائی حالات	۱۸۵
تعلیم، رنگین مزاجی، پہلوانی اور شراب نوشی	۱۸۸
پیشہ	۱۸۹
حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام	۱۹۰
عمری نوشتہ	۱۹۲
دوسرا خط	۱۹۴
بت پرستی	۱۹۵
حضرت عمر اور ام کلثوم	۱۹۶
کتابیات	۲۱۱

پیش لفظ

(ایک فاضل مقالہ نگار کے قلم سے)

زورِ حق بھی کیا چیز ہے جو باطل کے قدم جمنے نہیں دیتا۔ یہ قدرتِ حق دیکھیے کہ حکومت شام کے ہزاروں اور لاکھوں درہم و دینار حدیثوں کے بنانے پر صرف ہوگئے۔ لیکن وہ درہم و دینار اس بات کو کسی طرح چھپا نہ سکے کہ یہ حدیثیں حکومت شام کے کہنے سے بنائی گئی ہیں۔ اس پردہ کو چاک کرنے کے لیے فقرائے ملت اسلامیہ کو ایک پیسہ بھی صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوئی بلکہ وہ خود قمر تحقیق کے سامنے جامۂ کتان کی طرح تار تار ہوگیا۔ ورنہ ابو علی مدائنی جیسے شخص سے لکھوا دینے والی شے وہ انعام و اکرام نہ تھا بلکہ وہ زورِ حق تھا جسے بغیر ظاہر کیے ہوئے دل صبر نہ کر سکا۔ ورنہ احکام و اقوال خدا و رسولؐ کے بدل دینے میں ذرہ برابر بھی نہ حاکم شام کو کوئی باک تھا نہ اس کے ماننے والوں کو اس کی کوئی پروا تھی۔ اور زمانہ کتنا متدینین اہل اسلام سے پاک و صاف ہوگیا تھا کہ تعمیل حاکم شام مال و زر کی لالچ میں فوراً کی جاتی تھی چاہے قرآن محو ہو جائے یا حدیث رسولؐ۔ حکومت نے دماغوں پر اتنا تسلط قائم کر لیا تھا کہ لوگوں کو بدھ اور جمعہ میں امتیاز نہ رہا تھا۔ اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ علیؑ کون ہیں، فاطمہؑ کون ہیں رسول کون ہیں اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے رشتہ

Presented by www.ziaraat.com

کیا ہے؟ علامہ مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر و معاویہ و علیؑ کے بارے میں بحث کرتے تھے کہ وہیں ایک بوڑھا شامی بھی آپہنچا جس کی ڈاڑھی بڑی تھی اور ان لوگوں سے کہا کب تک تم لوگ علیؑ اور معاویہ کے بارے میں بحث کرتے رہو گے۔ ایک شخص نے اس سے کہا اچھا تم ہی بتاؤ تم ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے نے پوچھا کس کے متعلق سوال کرتے ہو۔ اس شخص نے کہا علیؑ ہی کے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے شامی نے کہا وہی علیؑ جو فاطمہؑ کے باپ تھے؟ اس شخص نے پوچھا فاطمہؑ کون تھیں۔ اس شامی نے کہا تھیں کون حضرت رسول خدا کی بیوی اور عائشہ کی بیٹی تھیں اور عائشہ معاویہ کی بہن تھیں۔ تب اس نے پوچھا کہ پھر علیؑ کا کیا ہوا۔ اس شامی نے کہا وہ تو حضرت رسولِ خداؐ کے سامنے غزوۂ حنین میں شہید ہو گئے (مروج الذہب ج ۲ ص ۱۰۸ برحاشیہ کامل)

حکومت شام دماغوں پر اتنی چھا چکی تھی کہ لوگوں کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کسی عمارت کا نام ہے یا کسی انسان کا (مروج الذہب)، وضع احادیث کا ایک کارخانہ تھا جس میں ضرورت کے مطابق حدیثیں ڈھالی جاتی تھیں۔ اگر کسی کو کبوتر بازی کا شوق ہوا تو حدیث رسولؐ موجود اور اگر پیاز کی خرید و فروخت میں کمی پیدا ہو گئی اور ذخیرہ سڑنے گلنے لگا تو حدیث رسول وضع کر لی گئی۔ باپ کی مستعملہ کنیز پر اگر بیٹے نے تصرف کرنا چاہا تو مفتیانِ شرعِ متین نے مال و زر کے ڈھیر دیکھ کے فتویٰ دے دیا کہ ہر دعوے کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے کنیز سے کہو کہ اس موقع کے دو گواہ پیش کرے تو دعویٰ قابل قبول ہے ورنہ تم کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ گواہ پیش کر سکی نہ تصرف سے محفوظ رہ سکی۔ دین کو اس طرح سے برباد اور شریعت کو اس طرح سے پامال کیا جا رہا تھا۔

واجب الاحترام صحابی وہ سمجھا جاتا تھا جو آل محمد سے عداوت شدیدہ رکھتا ہو جو آل محمد سے جتنا قریب تھا وہ دنیا کی نظروں میں اتنا ہی ذلیل و کم وقعت والا تھا۔

ابو الصلت ہروی جو حضرت امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ممتاز ترین صحابیوں میں سے تھے ان کے متعلق امام ذہبی نے اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ رجل صالح الا انہ شیعی۔ یہ تھے تو مرد صالح و نیکوکار ضرور مگر ایک عیب یہ تھا کہ یہ شیعہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی اچھائیاں تھیں، جتنی خوبیاں تھیں، جتنے محامد و محاسن تھے، جتنے فضائل و مناقب تھے وہ سب ایک شیعہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔

محمد بن ابوبکر جو ام المومنین عائشہ کے سگے بھائی تھے جب ان کی بہن ام المومنین (تمام مومنین کی ماں) ہو سکتی ہیں تو ماں کا بھائی ماموں ہی تو ہوتا ہے اس رشتہ سے محمد بن ابوبکر کو خال المومنین (تمام مومنین کا ماموں) کہنا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لقب کے لیے معاویہ ابن ابوسفیان کا انتخاب ہوا۔ اس لیے کہ محمد بن ابوبکر کے دل میں امیر المومنینؑ کی محبت جاگزیں تھی اور معاویہ کے دل میں عداوت۔ لہٰذا صاحب عداوت کو صاحب محبت پر ترجیح دی گئی۔

عمر بن سعد کو دنیا جانتی ہے کہ کیسا دشمنِ اہل بیت اور قاتل سردار جوانانِ جنت گزرا ہے مگر اس کے لیے ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب تقریب التہذیب میں لکھا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص المدنی نزیل الکوفۃ صدوق ولکن مقتہ الناس لکونہ امیرا علی الجیش الذین قتلوا الحسین بن علی۔ عمر بن سعد بن ابی وقاص مدینہ کا رہنے والا وارد حال کوفہ بہت زیادہ سچا ہے لیکن لوگ اس کو اس سبب سے دشمن رکھتے ہیں کہ یہ اس لشکر کا

Presented by www.ziaraat.com

سردار تھا جس نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کیا ہے۔ اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا عمر سعد کو دشمن رکھتی ہے لیکن ابن حجر اس کو دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک قتل حسینؑ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس جگہ سے یہ راز بھی سمجھتے چلیے کہ تمام صحاح ستہ میں صحیح بخاری سب سے زیادہ مستند اور معتبر کیوں سمجھی جاتی ہے۔ اس کا راز یہی ہے کہ یہ کتاب دشمنانِ آل محمدؐ کو کام میں لاکر لکھی گئی ہے۔ اس کے راوی زیادہ تر وہی ہیں جو اہل بیتؑ اطہار سے عداوت شدیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً مروان بن حکم۔ ابن حجر نے مروان کے لیے لکھا ہے کہ لا یثبت له صحبته۔ اس کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے مروان اور اس کے باپ حکم کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا جس کو مسعودی نے مروج الذہب میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ مروان هو طرید رسول اللّٰہ الذی غربه عن المدینه و نفاه عن جواره۔ یعنی مروان رسول اللہؐ کا مطرود ہے جس کو آنحضرت نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا اور اس کو اپنے پڑوس سے دور فرما دیا تھا۔ مروان آنحضرتؐ کے نزدیک قابل لعنت تھا۔ چنانچہ خود ام المومنین نے ایک مخاطبہ میں مروان سے کہا ہے کہ اما انت یا مروان فاشهد ان رسول اللّٰہ لعن اباک و انت فی صلبه۔ لیکن تو اے مروان! تو میں شہادت دیتی ہوں کہ پیغمبر نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی جب تو اس کے صلب میں موجود تھا۔ حضرت امیر المومنین اس کو ایک یہودی نما مسلمان سمجھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی کتاب فتاوائے عزیزیہ صفحہ ۱۹۳ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مروان را لعنت کردن از لوازم سنت و محبت اہل بیت است از جملہ فرائض ایمان است۔ مروان پر لعنت کرنا سنت اور محبت اہل بیت

لوازمات میں سے ہے جو منجملہ فرائض ایمان ہے۔

ایسے راوی سے امام بخاری نے روایت لی ہے۔ دیکھیے بخاری جلد اول، کتاب الہبہ باب ۱۶۳۰۔ حدیث نمبر ۲۴۲۲۔ باب مناقب زبیر بن عوام حدیث نمبر ۹۱۱ جلد دوم۔

دوسرا راوی عمران بن حطان ہے۔ یہ وہ راہ دین کا شناختہ راہ زن ہے جس نے اس ضربت کی تعریف کی ہے جو ابن ملجم مرادی ملعون نے حضرت امیر المومنین کے سر اقدس پر لگائی تھی۔ چنانچہ عمران بن حطان کہتا ہے

یا ضربة من تقی ما اراد بها　　الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا
انی لاذکره یوما فاحسبه　　اوفی البریة عند اللّٰہ میزانا

(اصابہ ابن حجر مطبوعہ کلکتہ جلد ۳ ص ۳۵۴ و حیواۃ الحیوان دمیری تحت لغت انسان)

یہ ضربت ایک متقی و پرہیزگار کے ہاتھ کی لگائی ہوئی ضربت تھی جو اس لیے لگائی گئی تھی کہ صاحب عرش اس سے راضی و خوشنود ہو۔ جب کبھی میں اس ضربت کو یاد کرتا ہوں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ میزان عمل میں اس سے بڑھ کر کوئی وزنی عمل نہ ہوگا

اب ہر مسلمان ذرا سوچے کہ کیا عمران بن حطان صف رواۃ میں شامل ہونے کے قابل ہے کیا اس لائق ہے کہ اس کی روایتوں پر اعتبار کیا جائے۔ مگر امام بخاری نے اس سے روایت لی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری جلد ۳ حدیث نمبر ۷۸۱۔

اسی طرح سے ایک راوی حریز بن عثمان ہے جو حضرت امیر المومنین سے اتنی عداوت رکھتا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں یہ حدیث جو ارشاد فرمائی ہے کہ علی بمنزلة هارون موسیٰ (علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی) تو حدیث تو صحیح ہے لیکن سننے والوں کو دھوکا

Presented by www.ziaraat.com

ہوا ہے۔ پیغمبر نے یہ فرمایا تھا قارون من موسٰی علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو قارون کو موسٰی سے تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ صہ ۲۳۹)

ایک راوی اشعث بن قیس ہیں۔ یہ بھی حضرت امیرالمومنینؑ کے قتل کی سازش میں شریک تھے (تذکرہ خواص الامہ) ان کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی اہل بیت کی دشمنی میں شہرۂ آفاق تھے۔ لڑکا محمد بن اشعث جو ابن زیاد کے یہاں سے جناب مسلم کے قتل کے لیے فوج لے کر آیا تھا اور لڑکی جعدہ بنت اشعث جس نے حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔

غرض کہ جو بھی اٹھا اس نے دامے درمے قدمے سخنے اہل بیتؑ اطہار کی دشمنی میں پورا زور صرف کر دیا۔

"امیر شام کی شومی قسمت خوں آشامیوں کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ بنی اُمیہ کی اُمت اس دولت واُبہت سمیت اسی رویہ پر گذر گئی بنی عباس اس دن سے بے پرواہ ہو گئے جس کے لیے خدائی اعلان تھا "یوماً عبوساً قمطریرا" اپنے اساسِ دولت کو وقارِ اہل بیتؑ مٹا کے مضبوط کرتے رہے۔ مسلم نے اپنی اسلام نوازیاں غلط انداز سے صحیح کیں۔ بخاری نے اپنی کتاب کو وزارت قرآن سپرد کر کے دل کا بخار اچھی طرح نکالا۔ ابن ماجہ کے تموج نے سفینہ فضل اہل بیتؑ کو متلاطم کر دیا۔ ابو داؤد نے اپنی کوششوں سے دولت وسلطنت کا دل اپنے لیے موم کر لیا۔ مشکوٰۃ نے الٰہی چراغ کے مقابل میں اپنے چراغ پیش کیے۔ ابن حجر نے "تطہیر الجنان" میں اپنی سنگ دلی کو اچھی طرح سراہا۔"

غرض کہ جو آیا وہ اقوال خدا و رسول سے جہاد کرتا ہوا آیا لیکن ہر دور میں وہ حق گو اور حق پرست بھی دنیا میں موجود رہے جنھوں نے باطل کے قدم ایک ساعت

کے لیے جمنے نہیں دیے۔ دست و پا قطع کر دیے گئے۔ زبانیں کاٹ دی گئیں، سولی پر چڑھا دیے گئے، قید خانوں میں قید کر دیے گئے لیکن سوائے کلمۂ حق کے دوسری بات زبان سے نہ نکلی۔ زمانہ ماضی سے یہی ڈھرا چلا آ رہا تھا۔ ابطال باطل لکھی گئی تو اس کا جواب احقاق الحق کی شکل میں سامنے آیا۔ عزیز مصر تعصب نے دہلی کے گندے نالے سے ایک بدبودار تحفہ شیعوں کو بھیجا تو یوسف کنعان دہلی نے بھی اس کا جواب نزہہ اثنا عشریہ کے نام سے دیا۔ شوکت عمریہ شائع ہوئی تو اس کا جواب ضربت حیدریہ کے نام سے دیا گیا۔ قیقاب لکھی گئی تو اس کا جواب کنٹاپ سے دیا گیا۔ سیف قاطع وجود میں آئی تو برق لامع نے چوندھیا دیا۔ موجودہ دور میں انھیں خرافات کا ایک مجموعہ المرتضی کے نام سے شائع ہوا جس میں حقائق کو چھپانے اور معارف پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ وہی راستہ اختیار کیا گیا ہے جو اسلاف کا تھا۔ انھیں نشانات پر چلنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلاف قائم کر گئے تھے۔ یقین تھا کہ یہ حرف آخر ہے اور ہماری بات کا جواب دینے والا کون ہے؟ مگر مشہور ہے ہر فرعونے را موسٰی۔ ابھی زمانہ کا دامن ایسے افراد سے خالی نہیں ہے کہ باطل حملہ آور ہوتا رہے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ حقائق و معارف پامال ہوتے رہیں اور وہ دیکھتے رہیں۔ حق پر آنچ آئے اور ان کا احساس و شعور بیدار نہ ہو۔ اس خدمت کے لیے خالق نے فروغ کاظمی کا انتخاب کیا جو محض شاعر ہی نہیں بحر تحقیق و تدقیق کے غواص بھی ہیں۔ میدان مناظرہ کے مجاہد اعظم بھی دریائے معرفت کے شناور بھی۔ جو ہمیشہ زبان سے احقاق حق اور قلم سے ابطال باطل کرتے رہے۔ کمال شاعری جن کے ذہن رسا کی ایک فکر نارسا کا نام ہے۔ اگر نظم کی لڑیاں ان کے تار نفس کے حرکات کا دم بھرتی ہیں تو نثر کے موتی ان کے صدف ذہن کے تبسم کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی عارفانہ طبیعت اس کو برداشت نہ کر سکی

کہ باطل حملہ آور ہو اور وہ خاموش رہیں۔ لہٰذا فروغ کاظمی اپنے میٹھی کردار اور بوذری گفتار کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور رات و دن کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد زیر نظر مجموعہ مرتب کر کے پیش کر دیا۔ اور باطل کے چہرہ پر وہ طمانچہ رسید کیا ہے کہ قیامت تک وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

فقط

گدائے باب اہل بیت

ایک مقالہ نگار

۲۵ رماہ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ

اہم گفتگو

اسلام میں جاگیرداری کی بدعت جاری کرنے والے حضرت عثمان تھے اور اُن کے بعد اس بدعت کی خبیث رسم کو ترقی اور وسعت دینے والے امیر شام معاویہ تھے اور اسی بدعت نے ہر ایک دور، ہر عہد اور ہر زمانے میں صورت بدل بدل کر اسلام کو تباہ اور مسلمانوں کو برباد کیا۔ کبھی اس نے شیرازۂ اسلامی کو منتشر کیا تو کبھی جذبۂ اسلامی کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور یہی عمل پیہم (جو بجائے خود ایک ظلم عظیم ہے) بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہد میں جاری رہا۔ البتہ بدلتے ہوئے دور اور حالات میں تغیرات کے تقاضوں نے مختلف نام اختیار کیے مگر ملوکیت وہی رہی۔ کوئی اسلام کے اولین دور کے سازشی مسلم حکمراں کی صورت میں سامنے آیا، کوئی مسلم ڈکٹیٹر کے روپ میں ابھرا، کہیں امارت کے نام سے خانہ ساز خلافت چلائی گئی اور کہیں شاہی کے نام سے پرانی استبدادیت کو جاری رکھا گیا۔ اسی سازشی ملوکیت، امارت، ڈکٹیٹرشپ شاہی اور شہنشاہی کے ساتھ درباریت اور جاگیرداریت نے موقع محل اور وقت و مقام کے لحاظ سے مختلف صورتیں بدل بدل کر اپنے وجود کو باقی رکھا اور اسی کے ناجائز ٹکڑوں پر پلنے والے خوشامدی، درباری، جاگیردار، عہدہ دار، ایمان فروش مورّخ، قاضی، ملّا، مفتی، راوی اور ضمیر فروش امراء اور علماء تھے، اور آج بھی موجود ہیں۔ اور یہی لوگ اسلام کو، مسلمانوں کو بلکہ پوری ملّت مسلمہ کو تباہ و برباد کرنے میں ہمیشہ

Presented by www.ziaraat.com

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق درباریوں اور جاگیرداروں اور فاجر امرار وعلمار کی جانب سے ہمیشہ خالص اسلامی تحریکوں کی مخالفت کی جاتی رہی اور آج بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی خباثت کی بدلی ہوئی ترقی یافتہ شکل فیصل ایوارڈ ہے جو ایک لاکھ سعودی ریال پر مشتمل ہے اور جسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کے ساتھ حق کو باطل کا لباس پہنانا پڑتا ہے اور مشقت سے اسلام کی خوبصورت تصویر پر وہابیت کی مکروہ تصویر بنانا پڑتی ہے اور اس کام کو بڑی جانفشانی کے ساتھ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے انجام دیا ہے اور ایسے کامیاب انداز میں انجام دیا کہ فیصل ایوارڈ حاصل کرلیا۔ اسی ایوارڈ نے ندوی صاحب کو نہ صرف دولت وشہرت کا مالک بنایا بلکہ ان کے نام ونمود کے تسلسل کو بھی باقی رکھا۔

ندوی صاحب سعودی اخراجات سے جو مہمل قسم کی کتابیں یا رسائل شائع فرما رہے ہیں، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اسلام محض ایک دکھاوا اور خلوص وعقیدت سے عاری ہے۔ اگر ندوی صاحب کے دل ودماغ میں حقیقی اسلام کی کوئی تصویر ہوتی یا اسلام کے لیے خلوص اور مسلمانوں کے لیے ذرا سا بھی درد ہوتا تو آپ ملّتِ مسلمہ کو مزید منتشر کرنے کی تحریری کوشش کبھی نہ فرماتے بلکہ مسلمانوں میں اتحاد وہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی فرماتے۔

مذکورہ عبارت حجۃ الاسلام، مولانا السیّد غلام حسین صاحب قبلہ مجتہد حیدرآبادی کے تاثرات اور خیالات سے ماخوذ ہے جو ایک طویل گفتگو کی شکل میں عالی جناب شوکت حسین صاحب قبلہ کی مایہ ناز تالیف اعلان حق میں اشاعت پذیر ہوچکی ہے اور چونکہ میں بہ ذات خود اپنے قلم سے مولانا ندوی صاحب کی پر اسرار شخصیت کا تعارف نہیں کرانا چاہتا تھا اس لیے مناسب تھا کہ اسی گفتگو کے اقتباس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کروں۔

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی میرے ہم وطن اور نظریاتی اختلافات کے باوجود میرے بھائی ہیں (یہ اور بات ہے کہ مولانا ندوی صاحب کا دیرینہ تعلق ندوہ سے ہے اور دارالندوہ وہ جگہ ہے جہاں کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ ص ۵۹،۵۸) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا کا قلم، قرطاس کی وادیوں میں بے نکیل اونٹ کی طرح بلبلاتا پھرے اور میں تماشائیوں کی صف میں کھڑا ہو کر اس بے راہ روی کا تماشہ دیکھوں۔

میرا شیوہ حق پرستی اور دنیا حق فروش
میں کہاں لے جاؤں اپنے میثمی کردار کو (مؤلف)

مولانا ندوی صاحب کے رشحات قلم کا دل آزار نتیجہ اور حالیہ تالیف "المرتضیٰ" میرے ایک مخلص دوست اور کرم فرما جناب سید انتخاب حسین صاحب کاظمی نے مجھے مرحمت فرمائی، جس کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا ندوی نے سیرت علوی کو سپر بنا کر، اسلام کی ان نزاعی شخصیتوں کا دفاع کیا ہے جو چودہ سو برس سے اختلافی ہیں اور جن کے غیر اسلامی طرزِ عمل نے اسلام کو پارہ پارہ کر کے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا، یا یوں کہا جائے کہ فاضل مولف نے محض اپنے مخصوص نظریات کی وضاحت کے لیے سیرت علوی کو بہانہ بنا کر، نہ یہ کہ صرف خلفائے ثلاثہ کی شان میں مدح کے گیت گائے ہیں بلکہ خانوادۂ رسالت پر وہابیت کا کیچڑ اچھالنے میں اپنی ذہنیت، کوتاہ بینی اور تاریخی بددیانتی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۵۔ بنی ہاشم ایک زمانہ تک اپنی قوم وہم وطن کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔ (المرتضیٰ ص ۳۱-۳۲)

Presented by www.ziaraat.com

○ ۔ ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا۔ (المرتضیٰ ص ۳۹)

○ ۔ ابو طالب کے بڑے بیٹے طالب کی غزوۂ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی (المرتضیٰ ۴۰)

○ ۔ عقیل ابن ابو طالب فتح مکہ کے بعد ایمان لائے (المرتضیٰ ۔ ۴۰-۴۱)

○ ۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ حضرت علیؑ کی ولادت اندرونِ کعبہ ہوئی، لیکن محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے وہ حکیم بن حزام تھے (المرتضیٰ ص ۴۸-۴۹)

○ ۔ اگر ابو بکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ (المرتضیٰ ص ۔ ۱۱۱)

○ ۔ تبلیغ سورۂ برائت کے ذیل میں مولانا ابو الحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر الحج بنا کر تین سو حاجیوں کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا تاکہ آپ اسلامی طریقے سے انھیں حج کرائیں اور حضرت علیؑ کو سورۂ برائت کی ابتدائی آیتوں کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ اس کی تبلیغ فرمائیں۔ راہ میں دونوں سے ملاقات ہوئی تو ابو بکر نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ میں مامور کی حیثیت سے چل رہا ہوں۔ (المرتضیٰ ۔ ۸۶-۸۷)

○ ۔ غدیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا دوست اور حامی میں ہوں اس کے دوست اور حامی علیؑ ہیں (المرتضیٰ ص ۸۷-۸۸)

○ ۔ اپنی علالت کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی، اور

رسول نے بیٹھ کر نماز پڑھی، حضرت علیؑ بھی موجود تھے۔ (المرتضیٰ ص ۹۰-۹۱)

○ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارہ میں یہ نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا۔ (المرتضیٰ ص ۱۲۱)

○ ۔ واقعہ قلم و قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی کا یہ کہنا ہے کہ کاغذ طلب کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تک حیات رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں کیا، اور خلافت کے بارہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی، اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ان وصیتوں میں یہ تھا کہ نماز اور روزہ کا خیال رکھا جائے اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جائے (المرتضیٰ ص ۱۲۳)

مولانا ابو الحسن ندوی نے غزوۂ بدر، احد، خندق اور خیبر کے اجمالی تذکرے میں خلفاء کی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اس لیے کہ ان معرکوں سے خلفاء کا فرار ثابت ہے، غزوۂ حنین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے کہ آپ کے ممدوحین کا پول کھلتا۔ غزوۂ تبوک کی واپسی پر واقعہ عقبہ کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ منافقوں کے چہرے بے نقاب ہوتے، میرے نزدیک مولانا کا یہ طرز عمل بد دیانتی پر مبنی ہے۔

○ ۔ مولانا ابو الحسن صاحب ندوی "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کی شرائط و مطالبات" کے ذیل میں فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے جو مشکل صورت حال سامنے آگئی تھی اور جس پیچیدہ مسئلہ سے یہ نوخیز امت دوچار تھی، اور جس سے مفر بھی نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن اس حادثہ کو پیش آنا ہی تھا کہ یہی سنت الٰہی ہے جس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:

Presented by www.ziaraat.com

”جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی خدا کی یہی عادت رہی ہے اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔“ (سورہ احزاب - ۶۲)

اس صورت حال پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ ایسا خلیفہ منتخب کر لیا جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں جن کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ کی توفیق ارزانی کی بدولت) وہ دین کو تحریف سے بچالے جائے اور امت کو جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو چھوڑا ہے، وہ خصوصیات یہ ہیں،

(۱) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام لانے کے بعد سے زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکمل اعتماد کا اس کو شرف حاصل رہا ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کی شہادت دی ہو اور دین کے متعدد اہم ارکان اور اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے اس کو اپنا قائم مقام بنایا ہو۔ اور ایسے خطرات سے پُر مواقع پر اس کو اپنے ساتھ لیا ہو، جس کے لیے اسی کو انتخاب کیا جاتا ہے جس پر پورا اعتماد اور مکمل بھروسہ ہو۔

(۲) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ بلاخیز آندھیوں کے وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی اصلیت کا چراغ جھلملا رہا ہو اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ ہو، ایسے سخت طوفان کے عالم میں جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طویل صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والے بھی سہم رہے ہوں، یہ شخص پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو اس نے اس موقع پر (اثبات واستقامت میں) انبیاء سابقین کے کردار کا مظاہرہ کیا ہو، جس نے نگاہوں سے پردے اٹھا دیے

ہوں اور صحیح عقیدہ اور دین کی اصلیت پر غبار نہ آنے دیا ہو۔

(۳) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ اسلام کا صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح اس کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ، جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں، تنگی و ترشی میں اور فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی میں، ہر ہر موقع اور ہر ساعت میں اس کے پیش نظر ہو۔

(۴) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکر اور اس کی غیرت اس کے اندر اس سے بدرجہا زیادہ ہو جس قدر کسی کو اپنے گھرانہ، ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی عزت و حرمت کے بارہ میں غیرت ہوتی ہے اور اس راہ میں محبوب سے محبوب شے اور عزیز سے عزیز ہستی کی پاسداری، کوئی تاویل و توجیہ، کسی طرح کا خوف یا طمع حائل نہ ہو سکتا ہو۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا اس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو اور آپ کے راستہ سے سرمو انحراف بھی اس کو گوارا نہ ہو اور اس سلسلہ میں کسی ملامت کا ڈر نہ ہو۔

(۶) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ دنیاوی جاہ و ثروت کا طالب نہ ہو اور نہ اس کو اپنے عیش و آرام کی فکر ہو، دولت دنیا اور لذت عیش کے معاملہ سے اس درجہ بے نیاز و یکسو ہو کہ سوائے اس کے قائد و ہادی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اپنے یا اپنے خاندان

Presented by www.ziaraat.com

کے لیے کسی حکومت کے قیام اور اس کی توسیع و ترقی کا خواب بھی کبھی اس نے نہ دیکھا ہو جیسا کہ قریب ترین ممالک (روم و فارس) کے حکمراں خاندانوں کا قدیم وتیرہ رہا ہے کہ ان کی ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لیے وقف رہی ہیں۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شرائط پر ہر طرح سے پورے اترے اور وہ ان تمام خصوصیات کے جامع تھے۔ اپنی خلافت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کی وفات کے بعد اپنے عہد خلافت میں آخری دم تک۔ اس طرح ثابت قدم رہے کہ کسی انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کے لیے انکار یا شک کی گنجائش نہیں ہے اور آپ کی یہ خصوصیات بدیہی صورت میں اور تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔" (المرتضیٰ ص ۹۸ تا ۱۰۱)

حضرت ابوبکر کی شان میں عربی انداز کا یہ نثری قصیدہ، جو اردو کا روپ اختیار کر کے مولانا ندوی کے قلم کی زبان پر جاری ہو کر صفحۂ قرطاس پر آیا، جھلات پر منحصر ہے۔ اور اس کی متذکرہ بالا عبارت کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ:۔

(۱) حضرت ابوبکر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع اور فرمانبردار رہے اور آنحضرت صلعم کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا۔

(۲) یہ کہ آنحضرت صلعم نے اہم ارکان و اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے آپ کو اپنا قائم مقام بنایا اور ایسے خطرناک مواقع پر آپ کو اپنے ساتھ رکھا، جس کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جس پر مکمل اطمینان اور بھروسہ ہو

(۳) یہ کہ حضرت ابوبکر بعد وفات پیغمبر اس وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی

اصلیت کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ لاحق تھا، اور اس وقت جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر اور پیغمبر اسلام کی طویل صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والے سہم رہے تھے، پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے اور آپ نے ثبات و استقامت کی منزل میں انبیاے ماسبق کا کردار کیا۔

(۴) حضرت ابوبکر کے رگ و پے میں، اسلام کے صحیح ادراک اور اس کی حقیقت کی روح تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں آپ کے پیش نظر تھا۔

(۵) یہ کہ حضرت ابوبکر میں دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکری صلاحیت بدرجہا زیادہ تھی۔

(۶) یہ کہ حضرت ابوبکر میں آنحضرت صلعم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا بے پایاں جذبہ موجود تھا اور آپ کو جادۂ رسالت سے سرمو انحراف گوارا نہ تھا

(۷) بعد وفات پیغمبر قائد و ہادی کی حیثیت سے حضرت ابوبکر کے علاوہ دوسری مثال نہیں ملتی۔

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

۵۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا۔ یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا۔" (المرتضیٰ ۱۰۱)

Presented by www.ziaraat.com

"اس کارنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔"
" (اس وقت) دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابو بکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" (سورہ توبہ ۔ ۴۰) (المرتضیٰ ص ۱۰۲)
"یہ وہ مدح ہے جس میں حضرت ابو بکر کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔"
(المرتضیٰ ص ۱۰۲)

٥۔ حضرت ابو بکر کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جس کو کہیں کہ بات بن گئی اور نہ کوئی سازش تھی، جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کبھی کبھی اس طرح کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا جو غالب اور حکمت والا ہے طے کردہ معاملہ تھا۔ (المرتضیٰ ص ۱۳۰)

٥۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس وقت منصب خلافت پر فائز ہوئے جس وقت صحابہ رسول بلکہ پوری امت میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ مہمات خلافت کا بار اٹھانے والا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا تھا۔ (ص ۱۳۶)
اس کا مطلب یہ ہوا کہ علیؑ سے قبل جو خلفا ہوئے وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل تھے۔

٥۔ تمام اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔ "ہم پیغمبروں کا گروہ (کسی مال کا کسی کو) وارث نہیں بناتا جو چھوڑ دیا وہ صدقہ ہوتا ہے۔" (ص ۱۳۷)

٥۔ باغ فدک کے معاملے میں حضرت فاطمہؑ کو حضرت ابو بکر سے شکوہ رہا، لیکن جب حضرت فاطمہؑ کی علالت نے شدت اختیار کی تو حضرت ابو بکر،

حضرت فاطمہؑ کی عیادت کے لیے گئے، اجازت طلب کی، حضرت علیؑ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابو بکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں، اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دو، حضرت فاطمہؑ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابو بکر اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی اور وہ (حضرت فاطمہؓ) ان سے خوش ہو گئیں۔

٥۔ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں۔ اس لیے حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علی نے بر سر عام بیعت کی (ص ۱۵۱)

٥۔ حضرت علی زندگی بھر حضرت ابو بکر کے اُن کی خلافت کے زمانہ میں ان کے معاون ان کے بہترین مشیر اور سچے خیر خواہ تھے (ص ۱۵۳ و ۱۵۴)

٥۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت عمر کو خلافت کے لیے اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروق میں قوت فیصلہ، مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔
(ص ۱۶۳-۱۶۴)

٥۔ حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمر کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ (ص ۱۷۶)

٥۔ جب حضرت عمر کی وفات ہو چکی تو حضرت علیؑ آئے اور حضرت عمر کے چہرے کو کھولا پھر کہا:۔ اے ابو حفص آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ

Presented by www.ziaraat.com

کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے جانا پسند کروں۔ (ص ۱۹۶)

ہ۔ حضرت علیؑ، حضرت عمر کی وفات پر رو رہے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا کہ عمر کی موت پر رو رہا ہوں۔ عمر کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے، جو قیامت تک پُر نہیں کیا جا سکے گا (المرتضیٰ ص ۱۹۶)

ہ۔ جب عثمان کی بیعت ہونے لگی تو حضرت علیؑ نے بھی بیعت کی۔ پہلے کی یا آخر میں اس میں اختلاف ہے۔ (ص ۲۰۲)

ہ۔ جب رقیہ کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی امّ کلثوم کا عقد بھی حضرت عثمان سے کر دیا اسی لیے ان کا لقب ذوالنورین تھا۔ (ص ۲۰۳) وغیرہ وغیرہ

عقائد ملّتِ جعفریہ کے خلاف یہ تمام باتیں جنھیں مولانا ندوی نے تحریر فرما کر مباحثات و مناظرات کا در باز کیا ہے، ایسی ہیں جسے شیعہ قوم برداشت کرنے سے قاصر ہے۔

اس لیے

ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا ندوی کو نئے انداز و نئے ڈھنگ سے جواب دیا جائے اور جواب کے ساتھ مولانا ندوی صاحب کی خدمت میں ان کے ممدوحین (خلفاء) کی سیرت اور کردار کا (پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مبنی) وہ تاریخی آئینہ پیش کیا جائے جس کی ضرورت ہے تاکہ موصوف کو وہ سب کچھ نظر آ جائے جو تاریخ کی کتابوں میں ہونے کے باوجود ان کی نظروں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اوجھل ہے۔

اس اہم موضوع پر خامہ فرسائی سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خلفاء کو اہمیت و افضلیت عطا کرنے میں مورخین و محدثین کا طریقۂ کار کیا تھا اور کن حالات کے تحت خلفاء کے حق میں فضیلتوں، حدیثوں اور روایتوں کا مہمل سرمایہ تاریخ کی کتابوں میں جمع ہوا۔ جو اسلام اور اہل اسلام کے لیے مصیبت بن گیا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں حدیثوں کے بیان کرنے کا جو طریقہ رائج تھا وہ زبانی تھا۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ عہد معاویہ میں شروع ہوا جب امیر شام نے عبیدؔ بن شریہ کو جو زبانی حدیثوں کا راوی تھا، صنعاء سے بلا کر کاتبوں اور محرروں کے ذریعہ اس کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو قلم بند کرایا۔ جس کے نتیجہ میں کئی کتابیں عالمِ وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" ہے جو معاویہ کے حکم سے لکھی گئی کتابوں میں غالباً سب سے پہلی کتاب ہے۔ عبید کے بعد عوانہ بن الحکم (المتوفی ۱۴۷ھ) کا نام قابل ذکر ہے جو اخبار و انساب کا ماہر تھا۔ اس نے عام کتابوں کے علاوہ خاص بنی امیہ اور معاویہ کے حالات پر ایک کتاب لکھی جو پہلوی زبان میں تھی اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ۱۱۷ھ میں ہشام بن عبدالملک کے دور میں ہوا۔

۱۴۳ھ میں جب تفسیر، فقہ اور حدیث کی تدوین شروع ہوئی تو دیگر علوم کے ساتھ تاریخ و رجال میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں اور محمدؔ بن اسحاق (المتوفی ۱۵۱ھ) نے سیرت نبوی پر ایک کتاب منصور عباسی کی تحریک پر لکھی جو غالباً فن تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔

اس کے بعد تاریخ بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اور بڑے بڑے نامور مورخ پیدا ہوتے رہے، ان مورخین میں جن لوگوں نے خاص طور پر صحابہ کے حالات قلم بند کیے ان میں نصر بن مزاحم کوفی، مصنف کتاب الجمل، سیف بن

Presented by www.ziaraat.com

عمر الاسدی مصنف کتاب فتوح الکبیر، معمر بن راشد کوفی مصنف کتاب المغازی، عبداللہ بن سعد زہری مصنف کتاب فتوحات خالد بن ولید، ابوالبختری وہب بن وہب مصنف کتاب صفت النبی وفضائل انصار، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ مدائنی، احمد بن حارث خزاز (مدائنی کا شاگرد) عبدالرحمٰن بن عبیدہ مصنف مناقب قریش، عمر بن الشبہ مصنف کتاب امراء الکوفہ وامراء البصرہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ ان مصنفین کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں لیکن دیگر کتابیں جو اس زمانے یا اس سے قریب تر زمانے میں لکھی گئیں ان میں بہت کچھ سرمایہ ان کتابوں کا محفوظ ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسلم قتیبہ کی کتاب المعارف۔ احمد بن داؤد ابوحنیفہ دینوری (المتوفی ۲۷۹ھ) کی کتاب اخبار الطوال۔ محمد بن سعد واقدی (المتوفی ۲۳۰ھ) کی کتاب طبقات ابن سعد (جو بارہ جلدوں میں ہے) محمد بن ابی یعقوب بن واضح کی کتاب تاریخ یعقوبی۔ احمد بن یحییٰ بلاذری کی کتاب فتوح البلدان اور انساب الاشراف۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (المتوفی ۳۱۰ھ) کی کتاب تاریخ طبری (جو تیرہ جلدوں میں ہے) علی بن الحسین المسعودی (المتوفی ۳۸۶ھ) کی کتاب مروج الذہب اور کتاب الاشراف التنبیہ وغیرہ۔ یہ تصانیف جس دور کی ہیں وہ متقدمین کا دور کہلاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے متوسطین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفدا، نویری اور سیوطی وغیرہ نے نام پیدا کیا۔ مگر ان لوگوں میں خاص کمی یہ تھی کہ تاریخ میں اضافہ کے بجائے انھوں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ متقدمین میں سے کسی کی تصنیف سامنے رکھ لی اور اس میں تغیرات و اختصار پیدا کر کے اس کی ہیئت بدل دی لیکن اس طریقۂ کار کے باوجود ان

کتابوں کو عوامی حلقہ میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی اور تاریخ ابن اثیر نے وہ شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ اکثر قدما کی تصنیفیں ناپید ہو گئیں۔

غرضکہ ابن اثیر کے بعد جو مورخین ابھرے انھوں نے بھی اپنی کتابوں کا ماخذ ابن اثیر کی کتاب کو قرار دیا۔ لیکن اس فہرست میں ابن خلدون کا نام شامل نہیں ہے کیونکہ اس کا انداز سب سے الگ ہے۔

بہرحال مختصر یہ کہ اموی اور عباسی عہد میں احادیث اور فقہ کی اشاعت بکثرت ہوئی اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں جھوٹی حدیثوں اور غلط روایتوں کی بنیاد پر خوب خوب کتابیں لکھی گئیں اور چونکہ بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں نے طاقت اور دولت کا استعمال کر کے خاص توجہ کے ساتھ کتابیں تصنیف کرائیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں خلفائے ثلاثہ، بنی امیہ اور بنی عباس کے لیے ان کی فضیلت میں کیا کچھ نہ لکھا ہوگا۔ جب کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ معاویہ کی حکومت کی بنیاد حضرت عثمان کی خلافت پر تھی۔ حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کی مرہون منت تھی، حضرت عمر کی خلافت حضرت ابوبکر کی نوازشوں کا نتیجہ تھی اور خود حضرت ابوبکر کی خلافت سقیفہ بنی ساعدہ میں دھاندلی اور بے ایمانی کا ماحصل تھی۔ چنانچہ حق فروش اور بے ضمیر محدثین اور مورخین نے دنیاوی منفعت کے لیے غلط، لغو، اور مہمل حدیثوں سے کتابوں کے دامن کو بھر دیا اور ہزاروں کی تعداد میں جعلی اور فرضی حدیثیں قلم کے ذریعہ استحکام پا گئیں۔

معاویہ کے دور استبداد میں یہ ناممکن تھا کہ خلفا کی شان کے خلاف کوئی ایک حرف بھی اپنی زبان پہ لاتا، اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جاتی اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے اور اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی جاتیں۔ یہی وہ خاص وجہ تھی کہ خلفا کے لیے تاریخ کا دامن جعلی حدیثوں اور غلط

Presented by www.ziaraat.com

روایتوں سے چھلک پڑا۔

چنانچہ امام بخاری نے جب اپنے دور میں صحیح حدیثوں کو جمع کرنا چاہا تو کئی لاکھ حدیثوں میں سے اپنی جامع میں کل ۷۳۹۳ حدیثوں کو جگہ دے سکے اور اگر ان میں سے مکررات کو علاحدہ کر دیا جائے تو مجموعی طور پر ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔ فرضی اور بے بنیاد حدیثوں کے اس طوفان نے اسلام اور اس کے مقصد کو جو نقصان عظیم پہنچایا اس کی تلافی پھر ممکن نہ ہو سکی۔ کیونکہ ان فرضی حدیثوں میں سے بہت سی مقبول ہو کر رواج پا گئیں جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال بے سبب پیغمبر کی طرف منسوب ہو گئے اور امام ابو حنیفہ کے دور میں حدیثوں کا جو دفتر تیار ہوا وہ لغویات، مہملات اور اغلاط سے پر تھا۔

محدثین کا کہنا ہے کہ امام مالک نے جب مؤطا لکھی تو اس وقت اس میں احادیث کی تعداد دس ہزار تھی لیکن تحقیق کے بعد یہ تعداد صرف چھ سات سو رہ گئی۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں بہت ہی کم تعداد میں ہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر نے جو حدیثیں رسول اللہ سے روایت کی ہیں ان کی کل تعداد سترہ ہے۔ عمر بن خطاب کی روایتوں سے پچاس سے زیادہ حدیثوں کا ثبوت نہیں ملتا اور یہی حال عثمان کا بھی ہے۔

اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بھی بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو حاکم کے نزدیک بالکل درست ہیں لیکن ائمہ احادیث کے نزدیک غلط اور مہمل ہیں۔ اور یہی نوعیت ان حدیثوں کی بھی ہے جنھیں ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور تقریباً یہی صورت خطیب بغدادی، ابو الفضل، ابو موسیٰ، ابن عساکر اور حافظ عبد الغنی کی پیش کردہ حدیثوں کی بھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی فرمایا ہے کہ ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابو الفضل،

ابو موسیٰ مداینی اور حافظ عبد الغنی وغیرہ جو حدیثوں کے امام تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خلفاء اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے۔

(سیرۃ النبی ص ۳۹)

معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان چوں کہ اہل سنت کے دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا تھے اس لیے اس مسلک کے راوی ان کے فضائل میں بے دھڑک غلط اور فرضی روایتیں اور حدیثیں بیان کرتے گئے اور علماء انھیں آنکھ بند کر کے اپنی کتابوں میں جمع کرتے گئے۔

غلط حدیثیں وضع کرنے میں ابو ہریرہ سب پر بھاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس حدیثیں ڈھالنے کی آٹومیٹک مشین تھی۔ چنانچہ صرف تقی ابن مخلد کی مسند میں ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو بتائی گئی اور بخاری کا کہنا ہے کہ ابو ہریرہ سے آٹھ سو علماء نے حدیثیں روایت کی ہیں چنانچہ جو حدیثیں نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مبالغہ آرائی پر منحصر ہیں اور خلفاء کے فضائل میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

جلیل القدر سنی عالم محمد بن عقیل کا کہنا ہے کہ امام حسنؑ سے صلح کے بعد معاویہ نے اپنے ہر گورنر، ہر حاکم اور ہر والی کو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ جو شخص حضرت علیؑ کے فضائل اور ان کی خوبیاں بیان کرے گا، حکومت اس سے بری الذمہ رہے گی۔ چنانچہ اس فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں کے واعظ اور خطیب منبروں سے حضرت علیؑ پر تبرّا کرنے لگے۔ اس نئی مصیبت اور افتاد میں سب سے زیادہ کوفہ کے لوگ مبتلا ہوئے، کیونکہ وہاں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مستزاد یہ کہ معاویہ نے ان لوگوں پر زیاد ابن سمیہ کو گورنر کی حیثیت سے مسلط کر دیا۔ یہ آل رسول

Presented by www.ziaraat.com

کا جانی دشمن، بدترین مخالف اور کوفہ کے شیعوں سے بخوبی آگاہ اور واقف تھا چنانچہ اس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس نے ہر شیعہ کو گرفتار کیا اور اسے قتل کیا۔ قتل ہونے سے جو بچ گئے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے گئے یا اُن کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی گئیں اور ہزاروں افراد کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ لاکھوں بے گھر اور آوارہ وطن کر دیے گئے۔ ایسے اندوہ ناک اور خونچکاں ماحول میں بھلا کس کی مجال تھی جو خلفاء کی شان کے خلاف زبان کھولنے کی جسارت کرتا۔

معاویہ نے اپنے گورنروں اور والیوں کے نام یہ فرمان بھی جاری کیا کہ حضرت علیؑ کے کسی بھی شیعہ کی بیان کی ہوئی کسی بھی روایت یا حدیث کے بارے میں کسی گواہی کو قبول نہ کیا جائے اس کے برعکس جو لوگ حضرت عثمان کے فضائل میں حدیثیں بیان کریں انھیں حکومت کی جانب سے خصوصی مراعات اور عزت دی جائے اور ان کی فہرست مرتب کر کے ہمارے پاس ارسال کی جائے تاکہ انھیں نوازا جاسکے۔ الغرض یہ شاہی فرمان جہاں جہاں پہنچا اسے خصوصی اہتمام کے ساتھ مشتہر کیا گیا اور حضرت عثمان کی شان میں حدیثیں جمع کرنے کے لیے جگہ جگہ کاتب مقرر کیے گئے۔

اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ دولت و ثروت کے بھوکے راوی زمین سے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور ہر کاذب انسان راوی بن گیا۔ چنانچہ لوگ حضرت عثمان کی شان میں بے سروپیر کی حدیثیں بیان کرتے اور کاتبوں سے انھیں لکھوا کر معاویہ کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہاں سے انعامات و جاگیروں کے پروانے جاری ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم وقفہ میں عثمان پر حدیثوں کا ایسا زبردست انبار اور ڈھیر لگ گیا کہ خود معاویہ بھی پریشان ہو گیا اور اسے

یہ فرمان جاری کرنا پڑا کہ حضرت عثمان پر حدیثیں زیادہ ہو چکی ہیں لہٰذا اس سلسلے کو روک کر راویوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شان میں حدیثیں بیان کریں اور اس بات کا خاص لحاظ رکھیں کہ جیسی حدیثیں حضرت علیؑ کے لیے رسول اللہ صلعم سے مروی ہیں بالکل ویسی ہی حدیثیں شیخین کے لیے بیان کی جائیں کیونکہ یہ تدبیر میرے لیے باعث مسرت ہے۔

اس فرمان کے بعد حضرت عثمان کی شان میں حدیث سازی کا سلسلہ بند ہوا اور حضرات ابوبکر و عمر کے لیے راویوں کی زبان پر احادیث و روایات کی فصل اُگنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جعلی اور فرضی حدیثوں اور روایتوں کے کھلیان لگنا شروع ہو گئے۔ اور ایسی ایسی خود ساختہ اور خود رَو حدیثیں عالم وجود میں آگئیں جن کی حیثیت چانڈو خانے کی گپ سے زیادہ قطعی نہیں ہے۔

یقیناً یہ وہ سیلاب تھا جس میں بڑے بڑے علماء، حفاظ اور مذہبی علوم کے علمبردار بہہ گئے۔ مستزاد یہ کہ یہی حدیثیں مدرسوں میں بھی رائج کر دی گئیں اور انھیں کی روشنی میں طلباء کو درس دیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو سچ تھا وہ جھوٹ بن گیا اور جو جھوٹ تھا اسے سچ مان لیا گیا۔ مختصر یہ کہ معاویہ کی اس کوشش نے خلفائے ثلاثہ کو نہ صرف فضیلتوں کے آسمان پر پہنچا دیا بلکہ کہیں کہیں پر انھیں رسول اللہ سے بھی افضل بنا دیا۔

دور حاضر میں یہی طریقۂ کار سعودی حکومت کا ہے جس کے ٹکڑوں پر پلنے والے حق فروش و ضمیر فروش علماء معاویہ کی "حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمٹیڈ" کی بنی ہوئی جعلی اور فرضی حدیثوں کے ذریعہ آل محمدؐ کے تقدس کو پامال کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان کا بس نہیں چلتا کہ کب اور کس وقت فضائلِ آلِ محمدؐ کو کتابوں سے خارج کر کے وہ جگہ خلفائے ثلاثہ کی فضیلتوں سے بھر دیں جو درحقیقت

Presented by www.ziaraat.com

کچھ بھی نہیں ہیں۔

یقیناً یہ ایک ایسا خطرناک منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے بعد اصل اسلام کی جگہ صرف عبدالوہاب کا خود ساختہ اسلام رہ جائے گا اور ہماری آنے والی نسلیں آل محمدؐ اور اسلام محمدؐ کے بارے میں وہ سب کچھ بھول جائیں گی جو انھیں یاد رکھنا چاہیے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کے تحت مجھے "المرتضیٰ" کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا ورنہ یہ حقیقت ہے کہ میں ایک شاعر ہوں اور صرف شاعر، دینی تالیفات کا میدان میرا نہیں ہے۔

چنانچہ اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی اس کتاب میں وہی کچھ پیش کیا ہے جو اس سے قبل کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تالیف میں میرا اپنا ذاتی قلمی سرمایہ کچھ نہیں ہے میری محنت صرف اتنی ہی ہے کہ میں نے مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تاریخی جواہر پاروں کو سمیٹ کر مولانا ابوالحسن ندوی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کی گرانقدر رائے پر منحصر ہے۔

میں نے اپنی اس تالیف میں عربی اور فارسی کی اصل عبارتوں کے بجائے صرف ترجمہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو عربی اور فارسی نہیں جانتے اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

آخر کلام میں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ میں اپنی اس کتاب میں کسی فرقہ کے کسی مسلمان سے مخاطب نہیں ہوں۔ بلکہ میرے مخاطب صرف مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اور وہابی مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں اور میری یہ کتاب صرف "المرتضیٰ" میں پیش کیے گئے اختلافی مسائل

کے جواب میں ہے اور بس۔۔۔

والسلام

فروغ کاظمی

۲۶ر جنوری ۱۹۹۰ء

قطعہ

کچھ ایسے منافق بھی اسلام میں بن بیٹھے، جنھیں اپنی پانے مرِ ریاست میں آخر
نبی نے بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا
مگر ان کی جھوٹی فضیلت میں ندوی نے جھوٹی حدیثوں کا لے کر سہارا
جو چاہا وہ "المرتضیٰ" میں بھی لکھا، نہ سوچا، نہ سمجھا، نہ دیکھا، نہ بھالا

فروغ کاظمی

Presented by www.ziaraat.com

باب اوّل

ابوبکر بن ابوقحافہ

شجرہ

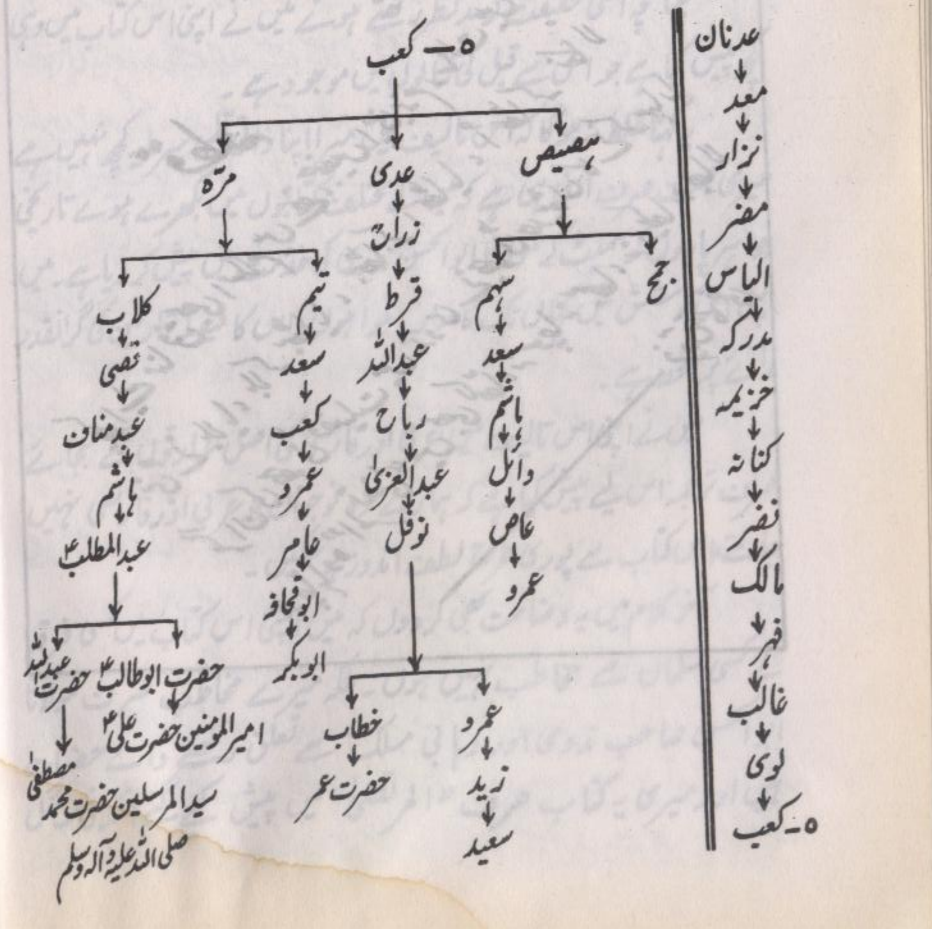

قریش کون؟

حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو خاندان یا قبیلۂ قریش میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ لہذا پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ درحقیقت ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا بھی یا نہیں۔

علم انساب کے ماہرین اور علم تاریخ کے محققین کے درمیان قریش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک گروہ کا خیال ہے صرف قصی ابن کلاب کی نسل اور اولاد ہی قریش کہلائے جانے کی مستحق ہے جبکہ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جناب قصی کے بزرگ فہر کی پوری نسل قریش ہے۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ہم جناب قصی کی نسل کو قریش تسلیم کرتے ہیں تو ان کے بھائیوں اور بزرگوں کو قریش سے خارج کرنا ہوگا۔ اور اگر قریش فہر کی نسل قرار پائے گی تو اس سلسلے کے جملہ افراد قریش تسلیم کیے جائیں گے یا اسے یوں واضح کردوں کہ زید نے اپنی ذاتی کمائی سے کوئی جائداد اپنے نام خریدی۔ تو اس جائداد کے مالک اور وارث زید یا ان کی اولادیں ہوں گی۔ بصورت دیگر اگر کوئی جائداد زید کے آبار و اجداد کی ہے اور اس کی نوعیت موروثی ہے تو اس سلسلے کے تمام افراد اس جائداد کے حقدار، وارث یا مالک ہوں گے ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر جناب قصی، قریش قرار پاتے ہیں تو صرف قصی کی اولادیں قریش قرار

Presented by www.ziaraat.com

پائیں گی۔ قصی کے باپ دادا یا خاندان کے دیگر افراد قریش نہیں ہو سکتے۔

محققین کے گروہ اوّل میں علامہ عبد ربہ کا کہنا ہے کہ قصی ابن کلاب نے چونکہ اہل عرب کو ایک مرکز پر جمع کیا اس لیے وہ قریش کہلائے۔ تقرّش کے معنی ایک مرکز پر جمع کرنا ہے اور قصی کو جمع کرنے والا کہتے ہیں (عقد الفرید ج ۲ ص ۳۱)

ابن اثیر جزری کا قول ہے کہ جب عرب کو قصی نے جمع کیا تو انھیں لوگ قریش کہنے لگے کیونکہ تقرش کے معنی اچھی طرح جمع ہونا ہے اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جب قصی ابن کلاب حرم کے سردار ہوئے اور انھوں نے بہتر و نمایاں کارکردگی انجام دی تو لوگ ان کو قرشی کہنے لگے اور پہلی مرتبہ قصی کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ لفظ اجتماع سے نکلا ہے یعنی قصی میں اچھی صفتیں جمع تھیں، اس لیے انھیں قریش کہا گیا۔ (تاریخ کامل ج ۲ ص ۳۸)

طبری کا کہنا ہے کہ جب قصی حرم (مکہ معظمہ) میں آکر مقیم ہوئے اور اس پر غالب آئے تو وہاں بہت اچھے کام کیے اس لیے لوگ انھیں قرشی کہنے لگے لہٰذا وہی پہلے شخص ہیں جنھیں یہ نام دیا گیا۔ (تاریخ طبری طبع مصر ج ۲ ص ۱۸۸)

علامہ شبلی نے اس واقعہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول ان ہی کو ملا۔ چنانچہ علامہ عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چوں کہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ تقرش کے معنی جمع کرنے کے ہیں اسی بنا پر اُن کو مجمع بھی کہتے ہیں۔ قصی ابن کلاب کا تذکرہ تفصیل سے طبقات ابن سعد جزو اول مطبوعہ لندن ۱۳۲۲ھ میں ص ۳۶ تا ۴۲ موجود ہے۔ قریش کی وجہ تسمیہ

میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اور قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا اس لیے وہ قریش کہلائے بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی گئی۔" (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۹)

طبری نے خاندان بنی امیہ کے مشہور حکمراں عبد الملک بن مروان کے لیے لکھا ہے کہ اس نے محمد بن جبیر سے پوچھا کہ قریش کا یہ نام کب سے پڑا۔ اس نے کہا کہ جب سے لوگ الگ الگ رہنے کے بعد حرم میں اکٹھا ہو گئے۔ کیونکہ تقرش کے معنی تجمّع ہیں۔ اس جواب پر خلیفہ عبد الملک بن مروان نے کہا کہ میں نے تو آج تک یہ نہیں سنا بلکہ یہ سنتا آرہا ہوں کہ قصی ہی کو قریش کہتے ہیں اور ان سے پہلے کسی کا نام قریش ہوا ہی نہیں۔ (طبری ج ۲ ص ۱۸۸ - ۱۸۹)

عبد الملک کے انکار کی یہ روایت فتح الباری فی شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۲ اور درمنثور ج ۶ ص ۳۹۸ میں بھی بیان ہوئی ہے اس کے علاوہ مفسرین نے بھی لکھا ہے جس سے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ قریش کے بارے میں عبد الملک بن مروان کا قول قصی ابن کلاب کے لیے درست ہے۔

ایسی صورت میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں ہی دائرۂ قریش سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بہ اعتبار شجرہ یہ دونوں حضرات قصی ابن کلاب کی اولادوں یا نسل میں نہیں آتے۔ لہٰذا اس اخراج کی بنا پر حضرات شیخین قریش کی فضیلت اور شرف سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تمام عرب میں قریش ہی کو سب سے زیادہ عزت اور توقیر حاصل تھی اور وہی عربوں کے سردار تسلیم کیے جاتے تھے۔ باقی تمام قبیلے قریش کے ماتحت اور فرماں بردار تھے۔

Presented by www.ziaraat.com

قریش کے بارے میں رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کی خوبی اور بھلائی صرف قریش ہیں۔ بغیر قریش کے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے، قریش کو وہ فضیلتیں ملی ہیں جو کسی کو بھی میسر نہیں ہوئیں۔ قریش اللہ کے خاص اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اگر کوئی قبیلہ قریش کی مخالفت کرے گا تو وہ شیطان کا گروہ ہوگا اور جو شخص قریش کی ذلت و خواری چاہے گا اللہ اس کو ذلیل و خوار کرے گا۔

(خلاصہ کنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۰)

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا تعلق قریش سے نہیں ہے، ان کی خلافتوں کا محل خود بخود ڈھیر ہو جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے سواد اعظم کا یہ دعویٰ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ خلیفہ قریش سے ہی ہوگا اور خلافت صرف قریش میں ہی محدود رہے گی، ظاہر کرتا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرات شیخین کا یہ کہنا کہ وہ قریش ہیں غلط بیانی پر منحصر تھا اور ان کا یہ اقدام خلافت ان تمام ارشادات پیغمبر کی نفی میں تھا جو زبان پیغمبر پر جاری ہوئے۔ مثلاً،

٥ — میری خلافت اور حکومت کے حقدار صرف قریش ہیں، جب تک کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہ کریں۔

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ رسول کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ اول قریشی ہونا دوسرے معصوم ہونا۔ یعنی کسی بھی حالت میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔

٥ — اس امت (اسلام) کی حکومت اور امارت صرف قریش ہی میں رہے گی اور جو شخص قریش سے دشمنی رکھے گا اللہ اس کو منہ کے بل جہنم میں جھونک دے گا۔

٥ — میرے بعد دین و دنیا کے حاکم بارہ ہوں گے اور وہ سب قریش ہی ہوں گے

٥ — دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک اس میں امامت قائم رہے گی اور اماموں کی تعداد بارہ ہوگی، جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔ اس کے بعد فتنہ و فساد پھیلے گا اور قیامت آئے گی۔

دکنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۲ و ج ۷ ص ۱۳۸ تا ۱۴۰، کتاب الفتن ص ۶۲۸ صحیح مسلم مطبوعہ دہلی ج ۲ ص ۱۱۹، جامع ترمذی ص ۲۶۹، مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۹۳، سنن ابی داؤد ص ۵۸۸، صحیح بخاری پ ۱۴، پ ۲۹ باب مناقب، تفسیر در منشور، تفسیر معالم التنزیل اور جامع الاصول وغیرہ

قریش کی ابتدا چوں کہ قصی ابن کلاب کی ذات خاص سے وابستہ ہے اس لیے جناب قصی سے قبل ان کے خاندان میں جتنے بھی لوگ شامل ہیں انھیں قریش نہیں قرار دیا جا سکتا البتہ جناب قصی یا ان کی نسل میں عبد مناف، عبدالمطلب، حضرت عبداللہ، حضرت ابوطالبؑ، حضرت رسول خداؐ، حضرت علیؑ یا ان کی اولادیں جو درحقیقت قریش ہیں ان سے انکار بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا حشر میں جو حال شیخین کی غاصبانہ خلافت کا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اس کے برعکس کچھ مورخین کا خیال یہ بھی ہے کہ قریش صرف قصی ابن کلاب کی اولادوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ قصی کے بزرگ فہر ابن مالک کی پوری نسل قریش ہے۔

عقل سلیم اور دلائل کی روشنی میں ان مورخین کا یہ خیال قابل قبول اس لیے نہیں ہو سکتا کہ قصی ابن کِلاب کا قریش ہونا ثابت ہے پھر بھی ہم اگر اس بے دلیل بات کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیں تو حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر خاندان رسالت سے کوسوں دور ہیں۔ اور حضرت ابوبکر کا شجرہ آٹھویں پشت میں اور حضرت عمر کا شجرہ نویں پشت میں کعب ابن لوی سے ملتا ہے جو رسول خداؐ کے بھی بزرگ تھے۔ اس کے برعکس حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

Presented by www.ziaraat.com

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے ۔ اس حیثیت سے خلافت پر حضرت علیؑ کا حق زیادہ تھا نہ کہ حضرات شیخین کا ۔

ابوبکر خلیفہ تھے یا خالفہ؟

نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ ایک روز ایک عرب نے حضرت ابوبکر سے دریافت کیا کہ کیا آپ خلیفہ ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں خلیفہ نہیں خالفہ ہوں۔

٥۔ صاحب نہایہ خالفہ کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ خالفہ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی خیر وخوبی نہ ہو۔

٥۔ قاموس میں خالفہ کے معنیٰ سفیہ کے ہیں۔

(اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۵۵ بحوالہ نہایہ ابن اثیر)

٥۔ لغات کشوری میں سفیہ کے معنی میں "نادان، کم عقل اور بے وقوف" تحریر ہے۔

لہذا کسی وہابی کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکر فہم وفراست کے حامل تھے، محض خوش فہمی، خوش اعتقادی اور ابوبکر نوازی کی دلیل ہے۔

پیدائش

تاریخ کی کسی کتاب میں میری نظر سے آج تک ایسی کوئی روایت نہیں گزری جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت ابوبکر کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ آپ، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوا دو برس یا تین برس چھوٹے تھے اور آپ ۳،۶۵ میں متولد ہوئے۔ لیکن بخاری (باب الہجرت)

Presented by www.ziaraat.com

کی ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کو روانہ ہوئے تو آگے اونٹ پر حضرت ابوبکر سوار تھے کیونکہ یہ بوڑھے تھے اور انھیں لوگ پہچانتے تھے۔

بہر حال حضرت ابوبکر چھوٹے تھے یا بڑے، اس سے آپ کی فضیلت میں کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو سوال تاریخ پیدائش کا ہے۔ کہ ملت مسلمہ خلیفہ اول کی تاریخ پیدائش سے بیگانہ کیوں ہے؟ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر کی شخصیت ایسی تھی ہی نہیں کہ اس دور کے راوی یا اسلام کے ابتدائی دور کے محققین و مورخین آپ کی تاریخ ولادت کی طرف متوجہ ہوتے اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی سے گذارش کروں گا کہ وہ ثبوت کے ساتھ اپنے اس دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا کی تاریخ پیدائش کی وضاحت فرمادیں۔

ابوبکر کی وجہ تسمیہ اور نام

مصر کے مشہور مصنف محمد حسین ہیکل کی عربی کتاب "حضرت ابوبکر" کے مترجم محمد احمد پانی پتی ابوبکر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"بکر عربی میں جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ چونکہ ابوبکر کو اونٹوں کی پرورش و پرداخت کا بے حد شوق تھا اور آپ اونٹوں کے علاج ومعالجہ میں بھی مہارت رکھتے تھے اس لیے آپ کو لوگوں نے ابوبکر (اونٹ کا باپ) کہنا شروع کر دیا اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔"

(حضرت ابوبکر ص ۲۵)

حضرت ابوبکر کا نام ان کے زمانۂ کفر میں عبدالکعبہ تھا۔ اسلام قبول کرنے

کے بعد عبداللہ ہوا لیکن آپ کی کنیت نے آپ کے کسی نام کو ابھرنے نہ دیا اور آج ساری دنیا آپ کو ابوبکر کے ہی نام سے جانتی ہے۔

حلیہ

عبدالرحمن بن حافظ عمر الدین نے اپنی کتاب "ابوبکر کی سوانح عمری" میں حضرت ابوبکر کا حلیہ یوں تحریر فرمایا ہے:

"حضرت ابوبکر کا رنگ سفید زردی مائل تھا۔ بدن چھریرا اور پیشانی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ رخسار اس قدر پچکے تھے کہ چہرے کی سب رگیں ابھری رہتی تھیں داڑھی ہر وقت مہندی اور خضاب سے رنگین رہتی تھی اور سب سے خاص بات یہ تھی کہ ہاتھ کی انگلیوں پر بال بالکل نہیں تھے۔"

(سوانح عمری حضرت ابوبکر مولفہ عبدالرحمن ص ۱۲۴)

براعتبار علم قیافہ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہونا بغض اور کینہ پروری کی علامت ہے اور ہاتھ کی انگلیوں پر بال نہ ہونا بزدلی اور نامردی کی دلیل ہے۔

ابتدائی زندگی

حضرت ابوبکر کے بچپن یا جوانی کے بہت کم واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں اور جو واقعات ہیں بھی ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی زندگی کے ابتدائی خدوخال کیا تھے؟ جس وقت آپ مسلمان ہوئے اس وقت آپ کے باپ ابوقحافہ زندہ تھے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے باپ پر آپ کے اسلام لانے کا کیا اثر ہوا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں اپنے باپ ابوقحافہ سے

Presented by www.ziaraat.com

کیا اثر قبول کیا۔

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourrier.com

والدین

حضرت ابو بکر کے والد کا نام عثمان بن عامر اور ان کی کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ کا نام سلمٰی تھا جو صخر بن عمرو کی صاحبزادی اور ابو قحافہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ حضرت ابو بکر کے والد قحافہ نے ۹۷ برس کی عمر پائی۔ فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں مسلمان ہوئے اور ۱۴ھ ہجری میں موت سے ہمکنار ہوگئے۔ اس طرح آپ کل چار سال کچھ ماہ مسلمان رہے اور اپنی زندگی کے ۹۲ برس آپ نے کفر اور بت پرستی میں گذارے۔

تعلیم

حضرت ابو بکر چونکہ زمانۂ جاہلیت کی پیداوار تھے اور کفر و بت پرستی کی چھاؤں میں آپ نے آنکھیں کھولی تھیں اس لیے جہل آپ کے ظاہر و باطن میں فطرتاً دخیل تھا۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود تمام مسائل شرعیہ سے ناواقف و نابلد تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں

(۱) ایک دادی نے اپنے مرحوم پوتے کی جائداد سے اپنا حق طلب فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تیرا حق نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں کسی مسلمان فقیہ سے دریافت کرلوں تو جواب دوں۔

(مشکوٰۃ شریف، مؤطا ص ۳۸۷)

(۲) دادی کی موجودگی میں آپ نے متوفی کی جائداد کا چھٹاں حصہ نانی کو دلوایا۔ (تحفۃ العباد ص ۵۵۴)

(۳) فجاۃ السلمی یا ایاس السلمی کو زندہ آگ میں جلوایا۔ (یہ حکم خلاف شرع تھا)

(۴) چور کا بایاں ہاتھ کٹوایا۔ (یہ حکم بھی خلاف شرع تھا)

(۵) آپ مسئلہ کلالہ و میراث جدہ سے ناواقف تھے۔ (کنز العمال)

(۶) آپ کے پاس ایک یہودی آیا اور اس نے آپ سے تین سوالات کیے۔ (۱) کون سی چیز اللہ کے لیے نہیں ہے (۲) کون سی چیز اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ (۳) کون سی چیز اللہ نہیں جانتا۔

یہودی کے یہ سوالات سن کر آپ بغلیں جھانکنے لگے۔ آخرکار وہ یہودی جواب نہ پاکر آپ کی علمی صلاحیتوں کو کوستا ہوا باب شہر علم کی چوکھٹ پر آیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسکراہٹ سے اس یہودی کا استقبال کیا اور فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو کس ارادے سے آیا ہے پھر آپ نے اس کے سوالوں کے جوابات مرحمت فرمائے اور فرمایا کہ اللہ لاشریک ہے یعنی کسی شے کی شرکت کا تصور اللہ کے لیے نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے نزدیک فقر و جور نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ اپنے نفس کے لیے بیٹا، بیٹی نہیں جانتا۔ جوابات سن کر وہ یہودی مسلمان ہوا اور کہا کہ بے شک آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی و جانشین ہیں۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو حضرت ابو بکر کے استعداد علمی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ لیکن سخت حیرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسے خلیفہ کا تقابل اس مقدس اور عظیم ترین شخصیت سے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کے دروازہ ہیں۔

(کوکب دری ص ۱۵۰، ینابیع المودۃ باب ۱۴ ص ۱۰۷، ارجح المطالب ص ۱۳۱، صحیح ترمذی، مستدرک حاکم،

Presented by www.ziaraat.com

اور صواعق محرقہ وغیرہ)

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی علمی حیثیت کی تشریح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ امام شبلنجی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے علم و فہم وغیرہ کے لیے بہت سی جلدیں درکار ہیں۔ محمد ابن طلحہ شافعی کا کہنا ہے کہ امام المفسرین جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ علم و حکمت کے دس درجوں میں سے نو حضرت علی کو ملے ہیں اور دسویں میں تمام دنیا کے علماء شامل ہیں اور اس دسویں درجہ میں بھی علیؑ کو اوّلیت اور افضلیت حاصل ہے۔

مولائے کائنات کی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور عظیم المرتبت شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے بیروت کے عیسائی ادیب فوائد الاحترام البستانی اپنی کتاب "حضرت علی ابن ابی طالب، نہج البلاغہ و درس منتخبات" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت علیؑ کی شخصیت ایک خاص کشش والی شخصیت ہے جس کے گرد روایت، حدیث اور مورخین کے قلم گردش کرتے رہتے ہیں اور ناقدین و مفکرین کی عقلیں اس شخصیت کو سمجھنے میں کوشاں رہی ہیں اور زہاد و ارباب سلوک کے اذہان ان کی سیرت اور طرز زندگی کی طرف متوجہ رہے ہیں اور ان کے علم کے سائے میں ارباب ادب کی ایک بڑی جماعت چلتی رہتی ہے۔ مختلف اور جداگانہ نظریات اور کثیر التعداد مناظرات جو بہ امتداد زمانہ سنی اور شیعہ فرقوں میں رہا کیے ہیں وہ اس عظیم الشان انسان کی بلندی اور رفعت میں اضافہ ہی کرتے رہے ہیں اور اس کے کمالات عقلیہ کی نمائش ان مناظرات کے پردوں سے جو کبھی گہرے اور اکثر اوقات ہلکے رہے ہیں زیادہ ہی ہوتی رہی ہے۔"

(ماخوذ از بلاغ المبین ج ۲ ص ۱۵۰۰ تا ۱۵۰۱)

قول پیغمبر ہے کہ میری امت میں سب سے زیادہ عالم و دانا میرے بعد علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔ (کوکب دری ص ۱۸۱)

حضرت علی علیہ السلام نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب پیدا کر لیے ہیں۔ ایک منزل پر یہ بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھے اس طرح علم بھرایا ہے جس طرح کبوتر اپنے بچہ کو دانہ بھراتا ہے۔ ایک مقام پر یہ بھی فرمایا کہ میری زندگی میں جو چاہو مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تمہارے درمیان میں نہ رہوں اور ایک مقام پر یہ فرمایا کہ آسمان کے بارے میں مجھ سے جو سوال بھی کرنا چاہو کرو کیونکہ مجھے زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کا علم ہے۔ ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے علم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خشکی میں کون سی آیت نازل ہوئی اور تری میں کون سی آیت نازل ہوئی۔

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تالیف کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس علمی سلسلے کو آگے بڑھایا جاسکے بس یہی کہنا کافی ہے کہ جو علم رسول کا حامل ہو اس سے جاہلوں کا کیا تقابل!

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

پیشہ

سن و شعور کو پہنچ کر حضرت ابوبکر نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور کپڑے کی تجارت شروع کی جس میں آپ نے اپنی نفع خوری کی بدولت بڑا مال کمایا اور غیر معمولی ترقی کی یہاں تک کہ آپ کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔

Presented by www.ziaraat.com

نفع خوری

نفع خوری کے معاملات میں حضرت ابوبکر کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں تھا۔ گراں فروشی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے رسول اللہؐ کو بھی معاف نہیں کیا اور دو سو درہم کا خریدا ہوا ایک مریل اونٹ رسول اللہؐ کے ہاتھ نو سو درہم کا فروخت کر کے سات سو درہم کا منافع حاصل کر لیا۔ (نور ایمان ص ۵۵ بحوالہ مدارج النبوۃ)

اس واقعہ سے حضرت ابوبکر کی تاجرانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی صورت میں "المرتضیٰ" کے فاضل مولف مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت ابوبکر نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا کیوں کر قرین قیاس اور قابل قبول ہو سکتا ہے۔

شراب نوشی

حرام ہونے کے باوجود شراب حضرت ابوبکر کے مشرب میں حلال تھی۔ چنانچہ اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۶ میں بحوالۂ فتح الباری تحریر ہے کہ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ شراب نوشی فرماتے رہے اور آپ نے اپنے اس محبوب مشغلے کو ترک نہیں کیا

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

ابوبکر کا مسلمان ہونا

حضرت ابوبکر کے اسلام اختیار کرنے کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر اختلافی ہے بعض علمار کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابوبکر پہلے شخص ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی اسلام لائے۔ بعض نے خوش اعتقادی کی حدود سے گزر کر آپ کو سابق الاسلام بھی کہہ دیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چوتھا ہے اور بعض علمار کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اسلام اس وقت قبول فرمایا جب پچاس سے زیادہ افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس ذیل میں حضرت ابوبکر کے شیدائی مولوی عبدالشکور پاٹا نالوی کا کہنا ہے کہ پیغمبر کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی ابوبکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پھر موصوف نے اپنی کتاب خلفائے راشدین کے حاشیہ پر یہ وضاحت بھی فرمادی کہ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، لڑکوں میں حضرت علیؑ، غلاموں میں زید بن حارثہ اور آزادوں میں حضرت ابوبکر سب سے پہلے اسلام لائے (خلفائے راشدین ص ۲۰)

مولوی عبدالشکور کا نظریہ اوّل اُن کی اپنی ذہنی کثافت کا آئینہ ہے اور حاشیہ پر کی گئی وضاحت مولانا شبلی نعمانی کے خیال کی تائید میں ہے جسے نعمانی صاحب نے یوں تحریر فرمایا ہے کہ سب سے پہلے خدیجہؓ زوجۂ رسولؐ، دوسرے حضرت علیؑ تیسرے زید بن حارثہ، جو آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور چوتھے شخص ابوبکر تھے جو اسلام لائے (سیرۃ النبی)

اس طرح مولانا شبلی نعمانی نے اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد حضرت علیؑ کو پہلے نمبر پر اور حضرت ابوبکر کو تیسرے نمبر پر تسلیم کیا ہے۔ جب کہ عبدالشکور کی وہابیت نے عورتوں، لڑکوں، غلاموں اور آزادوں میں اصل واقعہ کو محصور کر کے حقیقت پر ابہام کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ طبری کی تحقیق مولوی عبدالشکور اور مولانا شبلی دونوں کے نظریہ تحقیق کو باطل قرار دیتی ہے۔ اس ذیل میں طبری کا کہنا ہے کہ:

"محمد بن سعید سے مروی ہے کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا

Presented by www.ziaraat.com

کہ کیا آپ لوگوں میں حضرت ابوبکر سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے انھوں نے کہا یہ بات غلط ہے۔ ابوبکر سے پہلے پچاس سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۵)

ان اختلافات کے مابین صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابوبکر کے قبول اسلام کا حقیقی نمبر کیا تھا۔ البتہ حضرت ابوبکر کے مسلمان ہونے کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کے ذیل میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے مسلمان ہونے کا سہرا کاہنوں اور نجومیوں کے سر ہے۔ کیونکہ آپ نے نجومیوں سے سن رکھا تھا کہ اسلام عنقریب ترقی کر کے ساری دنیا میں پھیلے گا اس لیے آپ نے اسلام اختیار کر لیا۔ (خلاصۂ عبارت ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی ص ۵۷۔۵۸)

معلوم ہوا کہ اسلام کے محاسن اور اس کی افادیت کے تحت ابوبکر نے اسلام نہیں قبول کیا بلکہ اپنے ذاتی مفاد، حصول مقصد اور مستقبل کی بقا کو مدنظر رکھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

اس کے برعکس حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام و ایمان کے بارے میں مورخین و محدثین کا جو نظریہ ہے اس کی بھی ایک جھلک پیش کر دینا ضروری ہے تاکہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

ابن سعد فرماتے ہیں کہ واقدی کا کہنا ہے کہ ہم سب کا اجماع اور اتفاق اس امر پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی حضرت علیؑ پہلے شخص ہیں جو ایمان لائے۔

(خلاصۂ عبارت تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ تا ۲۱۴)

ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ ایمان لائے اور آنحضرت کے ساتھ آپ نے نماز پڑھی اس کے بعد زید بن حارثہ بن شرجبیل

بن کعب بن عبد العزیٰ بن امرؤ القیس بن عامر بن نعمان کلبی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے اسلام لائے۔ (خلاصہ عبارت سیرۃ النبی ابو محمد بن عبد الملک بن ہشام ج ۱ ص ۲۶۴ تا ۲۶۶)

استیعاب اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے اسلام لائے۔

ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ دس برس کے سن میں اسلام لائے، عن المجاہد میں بھی دس برس کی عمر میں اسلام لانا تحریر ہے۔ محمد بن عبد الرحمٰن زرارہ کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ نو سال کی عمر میں ایمان لائے جبکہ صحیح ترمذی میں آپ کی عمر آٹھ سال بتائی گئی ہے۔ غرض کہ اسی قسم کی تمام روایتیں تاریخ ابو الفدا ص ۱۱۵، ۱۱۶ حبیب السیر ج ۱ جزو ۳ ص ۱۵، تاریخ کامل، فردوس الاخبار، سیرۃ العلویہ حصہ اول ص ۱۳ اور کوکب دری وغیرہ میں موجود ہیں جن سے حضرت علیؑ کے ایمان و اسلام کی تابندگی ظاہر ہوتی ہے۔

ان تمام روایتوں کو نظر انداز کر کے اگر مولائے کائنات کی حیات طاہرہ کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی عمر کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ملتا جو (معاذ اللہ) کفر کے سائے میں گزرا ہو یا کسی مورخ کے قلم میں یہ جسارت پیدا ہوئی ہو کہ وہ آپ پر کفر کا بہتان رکھتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اور ایمان پر کسی تبصرے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام چونکہ سابق الاسلام اور سابق الایمان تھے اس لیے آپ کے سامنے اسلام قبول فرمانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ سابقہ اسلام کے ظاہر کرنے کا تھا اور جسے آپ نے اپنی ولادت کے بعد رسول اللہ صلعم کے سامنے خانۂ کعبہ میں ظاہر فرما دیا تھا جیسا کہ خلافت الٰہیہ حصہ اول ص ۳۶ میں ہے کہ:

"جب حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تو یہ مژدہ سن کر

Presented by www.ziaraat.com

رسول خداؐ تشریف لائے اور اس نومولود بچے کو اپنی گود میں لیا، آغوشِ رسالت کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چہرۂ رسول کی زیارت کی اور فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ بعض کتابوں میں دیگر صحیفہ ہائے آسمانی کی تلاوت کرنا بھی مرقوم ہے۔"

السلام علیک یا رسول اللہ کہنا خود اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ عالم وجود میں آتے ہی امیرالمومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے، محمدؐ بن عبداللہ کو اللہ کا رسول تسلیم کیا اور قرآن کی تلاوت کر کے اپنے ایمان کو ظاہر کر دیا۔ اور چونکہ اسلام کی اساس اور بنیاد ایمان پر ہے اس لیے آپ کا اسلام خود بخود ظہور میں آگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد حضرت علیؑ کے لیے اسلام اختیار کرنے یا قبول کرنے کا کوئی مسئلہ قطعی نہیں تھا اور چونکہ رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ کی خلقت ایک ہی نور سے ہوئی تھی، جیسا کہ پیغمبرؐ نے خود فرمایا کہ میرا نور اور علیؑ کا نور ایک ہے یا یہ کہ میں علیؑ سے ہوں اور علیؑ مجھ سے ہے۔ (کوکب دری ص ۱۵۲-۱۵۴) اس لیے اسلام کو دنیا والوں پر ظاہر کرنے کی جو صورت پیغمبر کے لیے تھی بالکل وہی صورت علیؑ کے لیے بھی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلعم نے اللہ کے حکم سے اسلام کا اعلان کر کے الوہیت کے بارے میں کفار کے سامنے اپنے نظریۂ وحدانیت کو پیش کیا تو علیؑ نے بھی اس کی تائید فرما کر اپنے سابقہ اسلام کو ظاہر کر دیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسی عمل کو مورخین نے اسلام اختیار یا قبول فرمانے سے تعبیر کر دیا۔

تاریخ کامل ج ۲ ص ۲۰ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ظہور اسلام سے سات برس قبل رسولؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔

تاریخ الامم والملوک میں عبادہ ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں بندۂ خدا ہوں اور رسولؐ کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم ہوں۔ میں نے ظہورِ اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علیؑ میرے بعد ہر مومن کا حاکم اور ولی ہے۔ میں خلائق کو ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت کرنے والے ہیں۔ علیؑ کا دوست مومن ہے اور دشمن منافق۔ علیؑ قسیم بہشت اور دوزخ ہیں۔ علیؑ کی دوستی انسان کے گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ ایندھن کو۔ علیؑ کی دوستی ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی بدی ضرر نہیں پہنچاتی اور علیؑ کی دشمنی ایسا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ علیؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ جو علیؑ کو ایذا پہنچائے گا خداوند عالم اس کو قیامت میں یہودی اور نصرانی اٹھائے گا۔ علیؑ کی محبت کے بغیر کوئی صراط مستقیم سے گذر نہیں سکتا۔"

(کوکب دری ص ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۷، ۱۶۸)

مسعودی نے بھی حضرت علیؑ کو سابق الاسلام تسلیم کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"جناب علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں نے جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک کثیر تعداد علماء اور محققین کی رائے یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے کبھی شرک اور کفر نہیں کیا اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب اسلام لائے۔ کیونکہ وہ ہر ایک فعل میں حضرت رسول خدا صلعم کی متابعت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں

Presented by www.ziaraat.com

سن بلوغ کو پہنچے۔ اسی لیے خدا نے انھیں عصمت عطا کی اور انھیں تمام برائیوں سے پاک وصاف رکھا کیونکہ یہ نفسِ رسول تھے۔ اور یہ دونوں یعنی حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ اطاعت و عبادت پر مجبور نہیں کیے گئے بلکہ دونوں نے اپنے اختیار سے بلا جبر اللہ کی اطاعت و عبادت کو اختیار کیا۔ علمار کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ سب سے پہلے علیؑ اسلام و ایمان لائے۔" (مروج الذہب مطبوعہ ۱۲۸۳ھ ج ۱ ص ۳۰۷)

مسعودی کے اس بیان سے حسب ذیل صراحت ہوتی ہے:

(۱) یہ کہ حضرت علیؑ اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں نے جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی تاکہ آپ کے سابق الاسلام یا سابق الایمان ہونے کو مشکوک بنایا جا سکے۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام نے از ابتدا تا انتہا کبھی شرک اور کفر اختیار نہیں کیا

(۳) حضرت علیؑ کا ہر فعل اور ہر عمل، پیغمبر اسلام کے ہر فعل اور ہر عمل سے مکمل طور پر متابعت اور مطابقت رکھتا تھا۔

(۴) یہ کہ جس طرح رسولؐ کا اسلام ازلی تھا اسی طرح حضرت علیؑ کا بھی اسلام ازلی تھا اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کب اسلام اختیار کیا۔

(۵) اللہ نے حضرت علیؑ کو عصمت عطا کی اور تمام کثافتوں اور برائیوں سے پاک رکھا۔

(۶) علیؑ نفسِ رسول تھے۔

(۷) اللہ نے علیؑ اور محمد کو اپنی اطاعت و عبادت پر مجبور نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے اپنی مرضی اور اختیار سے عبادت الٰہی کو قبول کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اختیار کرنے کا

جو جھگڑا پیدا کیا گیا اور اس کے جواز میں جو روایتیں مورخین کے قلم سے بیان ہوئیں وہ محض ابوبکر وغیرہ کو علیؑ کا ہمسر بنانے کی کوشش میں تھیں اور عقلی دلائل کی روشنی میں ان کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکر اور دیگر دو خلفا چونکہ کافر، مشرک، خاطی اور غیر معصوم تھے اس لیے مسلمان کہلائے جانے کے لیے ان کا اسلام اختیار کرنا ضروری تھا۔ لیکن وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت ابوبکر کا نمبر چوتھا ہے یا پچاس کے بعد۔۔۔

صدیق اکبر کون؟

تفسیر در منثور مطبوعہ مصر ج ۶ ص ۱۵۴ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیقین میں صرف تین افراد شامل ہیں جن میں اول علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں جنھوں نے میری رسالت کی گواہی دی۔ دوسرے حبیب نجار ہیں جو مومن آل یٰسین ہیں اور انھوں نے حضرت عیسٰی کی گواہی دی۔ تیسرے حزقیل مومن آل فرعون ہیں جنھوں نے حضرت موسٰی کی گواہی دی۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول خدا صلعم فرمایا کرتے تھے کہ تمام امتوں میں سبقت کرنے والے صرف تین ہیں جو ایک لمحہ کے لیے بھی کافر نہیں ہوئے۔ اول علیؑ ابن ابی طالبؑ، دوسرے صاحب یٰسین، تیسرے مومن آل فرعون ہیں۔ اور یہی صدیقین میں ہیں اور علیؑ ان سے افضل ہیں۔ (کوکب دری ص ۱۵۴)

حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیق صرف تین ہیں۔ اول علیؑ ابن ابی طالبؑ، دوسرے حبیب نجار جنھوں نے کہا تھا کہ اے میری قوم والو! رسولوں کی تابع داری کرو، تیسرے حزقیل جنھوں نے یہ کہا تھا کہ تم اس آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب

Presented by www.ziaraat.com

اللہ ہے۔ حضرت علیؑ حزقیل اور حبیب نجار سے افضل ہیں (ینابیع المودہ ص ۱۹۲-۹۴)
ریاض النضرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کا نام صدیق رکھا تھا۔

عبادہ ابن عبد اللہ کی روایت کے مطابق، حضرت علی علیہ السلام کا خود بھی قول ہے کہ میں بندۂ خدا ہوں، رسول اللہ کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر و فاروق اعظم ہوں۔ میں نے ظہور اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔ میرے سوا اگر کوئی دوسرا شخص اپنے کو صدیق یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ اور تاریخ کامل)

تاریخ کی اکثر کتابوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر کو صدیق اور حضرت عمر کو فاروق کا لقب "معاویہ حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ"، نے دیا ہے جو اصولاً غلط ہے۔

ابو بکر پیغمبرؐ اسلام کی نظر میں

حضرت ابو بکر سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سن کر ابو بکر نے کہا کہ حضور! شرک تو وہ ہے جو غیر اللہ کی پرستش (پوجا) کرے۔ ابو بکر کی اس گفتگو پر پیغمبرؐ نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اے ابو بکر! صفائی نہ پیش کرو۔ بخدا تم لوگوں میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ (درمنثور ج ۴ ص ۴۸، کنز العمال ج ۱ ص ۲۷۱، ازالۃ الخلفاء ج ۱ ص ۱۹۹، اور تفسیر کبیر برحاشیہ فتح البیان طبع مصر ج ۵ ص ۲۲۹)

مذکورہ بالا روایت سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ ابو بکر، پیغمبر اسلام کی نظر میں مشرک تھے دوسرے یہ کہ پیغمبر نے حضرت ابو بکر سے

مخاطب ہو کر "تم لوگوں" کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابو بکر تنہا مشرک نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ کچھ لوگ اور شامل تھے۔ ممکن ہے کہ یہ اشارہ حضرت عمر کی طرف رہا ہو۔ (واللہ اعلم)

بہر کیف حضرت ابو بکر اور ان کے ہمراہیوں کو وہ شخص مشرک قرار دے رہا ہے جس نے قرآن کریم کا یہ حکم سنایا تھا کہ مشرک پر جنت حرام ہے۔

قول رسولِ پاک ہے اللہ کی قسم — دنیا کے مشرکین پر جنت حرام ہے (مولف)

ابو بکر کا شیطانی ایمان

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ "ایمانِ ابو بکر و ایمان ابلیس واحد است" یعنی ابو بکر کا ایمان اور شیطان کا ایمان ایک ہے (نور ایمان ص ۵۴ بحوالہ تاریخ بغداد مولفہ ابن جزلہ)

امام ابو حنیفہ کے اس قول کی تائید خود حضرت ابو بکر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ جب اجماع سقیفہ کے دوسرے دن آپ نے مسجد نبوی کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ اے مسلمانو! اگر میں سیدھی راہ اختیار کروں تو تم مجھے خلیفہ مان کر میری اطاعت کرنا اور اگر میں ٹیڑھے راستے پر چلوں تو تم مجھے ہٹا دینا، کیوں کہ میرے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے جو مجھے ہر وقت بہکایا کرتا ہے اور مجھ پر سوار رہتا ہے۔ (اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۴۰ بحوالہ تاریخ طبری، ریاض النضرہ، صواعق محرقہ اور نور ایمان ص ۴۵ وغیرہ

اکثر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابو بکر کا یہ اشارہ حضرت عمر کی طرف تھا کیونکہ وہی آپ پر سوار رہتے تھے اور ہر وقت بہکایا کرتے تھے۔ لیکن میرے نزدیک اس موقع پر شیطان حقیقی کی طرف ابو بکر کا یہ اشارہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی، افسوس تو اس بات پر ہے کہ ندوی صاحب جیسے لوگ

Presented by www.ziaraat.com

حضرت ابوبکر کے اس شیطانی ایمان کا مقابلہ "کل ایمان" کے ایمان سے جب کرتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

وہ آئینہ ہے اہل کدورت کی زندگی
جس میں کوئی بھی عکس ابھر کر نہ آسکا (مؤلف)

میرے ذخیرۂ ادب میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ میں "کل ایمان" کے ایمان کا حال بیان کرسکوں تاہم یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخی اسناد کے تحت کچھ گفتگو ہوجائے تاکہ بات ناتمام نہ رہے۔ اس ذیل میں مولوی عبید اللہ امرتسری کا کہنا ہے کہ علی ہدایت کا جھنڈا اور ایمان کا مینار ہیں۔ علی تمام مومنوں سے ایمان کی منزل میں افضل اور مقدم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر حضرت علی کو کل ایمان کی سند عطا کی۔ علی سید المومنین، امام المتقین، امیر المومنین، صالح المومنین اور مولی المومنین ہیں۔ اور علیؑ کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے۔ (ارجح المطالب ص ۲۱ تا ۵۱)

علامہ شیخ سلیمان قندوزی فرماتے ہیں کہ جب حُبِ علیؑ ایمان ہے تو علی کے ایمان کا کیا عالم رہا ہوگا (ینابیع المودۃ ص ۸۰)

سید محمد صالح سنی الحنفی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر آسمان اور زمین پر بسنے والوں کا ایمان ترازو کے ایک پلہ میں اور حضرت علیؑ کا ایمان دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو علیؑ کے ایمان کا وزن زمین اور آسمان پر بسنے والوں کے ایمان کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ (کوکب دری ص ۱۸۷)

اس ارشاد پیغمبر کی روشنی میں یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ایمان تمام انبیا و ملائکہ اور آسمان و زمین پر بسنے والوں کے ایمان سے زیادہ

وزنی تھا۔

حضرت علی کے ایمانِ کاملہ پر بے شمار حدیثیں، روایتیں اور قرآنی آیتیں دلالت کرتی ہیں جنھیں پیش کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کے اوراق درکار ہیں۔

آخر میں ایک وضاحت اور کردوں کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی بدقسمتی سے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام "قسیم النار والجنۃ" بھی ہیں۔

گم کردہ راہ ہوگئے منزل شناس لوگ
بدلے گئے اصول سفر جب بھی راہ میں (مولف)

ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اپنی کتاب المرتضیٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند اور ناپسند کو اچھی طرح سمجھنا اور انتہائی باریک بینی کے ساتھ ان کا جائزہ لینا اور اس بات کی کوشش کرنا کہ آپ کی وفات کے بعد، آپ کی خواہشوں کے عین مطابق تمام امور انجام پائیں۔ اس کا نمونہ حضرت ابوبکر کے اس اصرار میں ملتا ہے کہ جب انھوں نے حضرت اسامہ کی قیادت میں فوج بھیجی"۔ (المرتضیٰ ۱۱۰، ۱۱۱)

پھر فرماتے ہیں:

"حضرت ابوہریرہ نے اس واقعہ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابوالاعرج حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ اس بات کو انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دہرایا پھر جیش اسامہ کے بھیجے جانے کا واقعہ بیان کیا، اور اس سلسلہ میں فرمایا

Presented by www.ziaraat.com

حضرت ابوبکر نے جیش اسامہ کو روانہ کر دیا اور کہا کہ جس جیش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کر دیا تھا اسے واپس نہیں ہونے دوں گا وہ جھنڈا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے اس کو میں نہیں کھولوں گا۔" (المرتضیٰ ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مولانا ندوی نے اپنے بیان یا ابوہریرہ کی روایت مہملہ کے ثبوت میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے مولانا موصوف کی بد دیانتی کا پتہ چلتا ہے۔ اور آپ نے جیش اسامہ کے واقعہ کو جس انداز سے پیش کرنے کی ناکام کوشش فرمائی ہے وہ بجائے خود حقائق کو مسخ کرنے کی بیّن دلیل ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ وضاحت بھی کہ "اگر حضرت ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی" رسول اسلام کی تیئیس ۲۳ سالہ تبلیغی محنتوں پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا ندوی کا باطل عقیدہ وہابی مسلک سے وابستہ ہے اس لیے ان کے نزدیک بے شک ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی یہ عبادت نہ ہوتی جس کا طریقہ وہابی مسلک میں رائج ہے بلکہ اللہ کی عبادت اس طور وطریقہ کی پابند ہوتی کہ جو طریقہ پیغمبر نے بتایا تھا یا جسے آل پیغمبرؐ نے اپنایا تھا۔

اپنی تالیف المرتضیٰ میں ابوہریرہ سے مسلسل اور بے تکلف روایتیں نقل کر کے مولانا نے خود ہی اپنے مولفانہ وقار کو مجروح کر لیا ہے جبکہ یہ حقیقت آپ کو معلوم ہوگی کہ ۷ھ میں مقام صہبا کی واپسی پر غزوۂ وادی القریٰ واقع ہوا تھا اور یہودیوں سے جنگ ہوئی تھی، ابوہریرہ جو یہودی تھے اسی سال مسلمان ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے کل تین سال عہد رسالت میں زندگی بسر کی۔ شرح مسلم نووی ص ۳۷۰، صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۰۹، الفاروق ج ۲ ص ۱۰۵ اور میزان الکبریٰ ج ۱ ص ۱۷ وغیرہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت عائشہ، عبداللہ بن عمر اور حضرت علیؑ وغیرہ ان کے بیان پر

یقین نہیں کرتے تھے اور انھیں جھوٹا تصور کرتے تھے۔

جیش اسامہ کا اصل واقعہ کیا ہے؟ اسے مورخین نے یوں بیان کیا ہے:

آخری حج کے بعد، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی علالت کے دوران یہ خبر موصول ہوئی کہ حکومت روم مدینہ پر حملہ کر کے اسے تاراج اور برباد کرنا چاہتی ہے، چنانچہ اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں مدینہ پر حملہ نہ ہو جائے آپؐ نے اُسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تمام مسلمانوں کو اس امر کی سخت تاکید فرما دی کہ علی کے علاوہ، کوئی بھی مسلمان خواہ وہ انصار ہو یا مہاجر مدینہ میں نہ رہے اور جو میرے اس حکم کو نہ مانے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔ (ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جز اوّل ص ۵۳) اس کے بعد آنحضرتؐ نے اسامہ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے روانہ کیا۔ انھوں نے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جُرف نامی مقام پر کیمپ لگا کر اکابرین صحابہ کا انتظار کیا لیکن وہ لوگ نہیں آئے۔ (طبری ج ۳ ص ۱۸۵، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ مصر، تہذیب التہذیب علامہ حجر عسقلانی مطبوعہ دار المعارف حیدرآباد دکن جز اول ص ۲۰۸ وغیرہ)

مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۸۸، تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۰ اور طبری ج ۳ ص ۱۸۸ میں ہے کہ نہ جانے والوں میں حضرت ابوبکر کے علاوہ حضرت عمر بھی تھے۔

مدارج النبوہ، تاریخ کامل اور تاریخ طبری کا شمار، معتبر اور مستند کتابوں میں ہے اور ان کتابوں کے مورخین اہل سنت ہیں۔ لہذا اس بات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے رسول اللہ صلعم کی دی ہوئی اللہ کی دائمی لعنت کو قبول کر لیا لیکن جیش اُسامہ کے ہمراہ نہیں گئے۔

چنانچہ حکم پیغمبرؐ کی اس نافرمانی پر خلاق کائنات نے فرمایا:

"جس شخص نے اللہ اور رسول کے حکم کی نافرمانی کی اور اپنی حدود

Presented by www.ziaraat.com

سے گذر گیا، خدا اس کو جہنم میں داخل کرے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس میں رسوائی کا عذاب ہے۔" (النساء - ۱۴)

مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۹۴ میں یہ بھی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ آخر صفر میں جب شدید درد سر میں مبتلا تھے تو رات کے وقت دعا کی خاطر آپ گھر سے نکل گئے۔ حضرت عائشہ نے یہ سمجھا کہ میری باری میں کسی اور بیوی کے پاس چلے گئے ہیں، چنانچہ آپ تلاش میں نکلیں تو حضور کو بقیع میں محو دعا پایا۔ آنحضرت نے جب عائشہ کو دیکھا تو فرمایا کہ اے عائشہ کاش تم پہلے مرجاتیں تو میں تمہارا کفن دفن اچھی طرح کر دیتا۔ اس پر حضرت عائشہ نے کہا کہ آپ تو چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں تاکہ آپ دوسری شادی کرلیں۔

ابوبکر کی معزولی

اس ذیل میں تاریخی پس منظر سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی وہ خود ساختہ روایت پیش کردوں جو آپ کی کتاب المرتضیٰ کے ص ۸۶۔۸۷ پر موجود ہے تاکہ ناظرین کو صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ مولانا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور انکسار طبیعت" کے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں،

"۹ھ میں حج فرض ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سال امیر الحج بنا کر بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی طریقہ پر حج کرائیں۔ اس وقت تک مشرکین اپنے طریقوں پر حج کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جن کا حج کا ارادہ تھا، ان کی تعداد تین سو تھی اور وہ سب اہل مدینہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۂ برأت نازل ہوئی، آپ نے حضرت علی کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں لے کر جاؤ اور قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) لوگوں کو سنا دینا اور بتا دینا کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، خانۂ کعبہ کا طواف کوئی ننگے جسم نہیں کرے گا اور آنحضرتؐ نے اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے تو وہ زندگی بھر پابند رہیں گے۔"

حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی عضباء پر نکلے، راستہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ نے کہا مامور کی حیثیت سے، دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ حضرت ابوبکر کی رہنمائی میں لوگوں نے مناسک حج ادا کیے۔ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؑ نے لوگوں میں ان باتوں کا اعلان کر دیا، جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت دی تھی۔" (المرتضیٰ ص ۸۶-۸۷)

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنے مذکورہ بیان کے تحت ابن ہشام ق ۲ ص ۵۴۳ تا ۵۴۶ کا حوالہ دیا ہے جو پوری عبارت کے اس آخری جملے کی تائید میں ہے کہ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؑ نے لوگوں (کفار) میں ان باتوں کا اعلان کیا جس کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی۔"

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکر کو امیر الحج بنانا، راستے میں حضرت علیؑ سے ابوبکر کا یہ دریافت فرمانا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ کا جواب دینا، حضرت ابوبکر کی رہنمائی میں لوگوں کا مناسک حج ادا کرنا وغیرہ، یہ ساری باتیں بے دلیل، بے حقیقت اور خود ساختہ ہیں۔

Presented by www.ziaraat.com

جو محض حضرت علیؑ پر ابو بکر کو افضل ظاہر کرنے کی غرض سے بیان کی گئی ہیں اور ان باتوں کے ضمن میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

اس حقیقت کو مستند و معتبر کتابوں کی روشنی میں، میں تحریر کرتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو مولانا ندوی صاحب انکار فرمائیں تاکہ آپ کی علمی صلاحیتیں کچھ اور اجاگر ہو کر اہل علم کے سامنے آجائیں۔ واقعہ یہ ہے:۔

سورۂ برأت کی ابتدائی دس آیتوں نے کفار و مشرکین پر خانہ کعبہ میں داخلہ کی سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ چنانچہ ۳؍ ذی الحجہ ۹ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ مکہ معظمہ جا کر دورانِ حج ان آیاتِ قرآنی کی تبلیغ فرمائیں۔ ابو بکر اپنی اس عارضی فضیلت پر ناز فرماتے ہوئے تین سو حاجیوں کے قافلے کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بدقسمتی سے آپ ابھی راستے ہی میں تھے کہ واپس بلا لیے گئے اور یہ سعادت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت ابو بکر جب کبیدہ خاطر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنی معزولی پر اشکبار ہوئے اور آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ کیا میرے بارے میں کوئی خاص بات واقع ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی خاص بات نہیں، اس امر میں خدا کا حکم ہے کہ میں خود جاؤں یا میری آل میں سے کوئی جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ شیخین میں دونوں تھے مگر معزول کیے گئے۔ ملاحظہ ہو قرۃ العین ۲۲۴، صحیح بخاری پ۲ ص ۲۳۸، ریاض النضرہ ص ۱۴۷، تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۴، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۵۰ تا ۱۶۰، روض الانف ج ۲ ص ۳۲۸، در منثور ج ۳ ص ۳۱۰، کنز العمال ج ۱ ص ۱۲۶ اور خصائص نسائی ص ۶۱ وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سورہ برارت دے کر روانہ کیا تھا کہ میں اہلِ مکہ میں جا کر یہ اعلان کر دوں کہ اس سال کے بعد کوئی بھی کافر او مشرک

حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی خانۂ کعبہ کا برہنہ طواف کرے، اور جنت میں صرف مومن ہی جائے گا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص کا کوئی معاہدہ ہے تو وہ وقت مقررہ تک ہی رہے گا آئندہ کوئی توسیع نہ ہوگی اور خدا اور اس کا رسولؐ مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ ابھی میں نے صرف تین دن کی مسافت طے کی تھی کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو ایک تیز رفتار ناقہ کے ذریعہ میری طرف روانہ کیا اور انھیں تاکید فرمادی کہ وہ مجھ سے سورۂ برارت لے کر اس کی تبلیغ خود کریں چنانچہ علیؑ نے وہی کیا جو حکمِ پیغمبرؐ تھا اور میں مایوسی کی حالت میں مدینہ واپس آگیا۔ جب پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو ناکامی اور نامرادی کے احساس نے مجھ پر گریہ طاری کر دیا اور میں بلک بلک کر رونے لگا، جب دل کچھ ٹھہرا تو میں نے پوچھا کہ کیا میرے متعلق کوئی خاص بات رونما ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہوا وہ اچھا ہوا، مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ سورۂ برارت کی تبلیغ میں خود کروں یا وہ شخص اس کام کو انجام دے جو میری آل میں شامل ہو۔ (خلاصہ عبارت مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲ بحوالہ نفس رسولؐ ص ۲۴۸)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں حضرت ابو بکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی نمائندگی یا نیابت کے اہل قطعی نہیں تھے۔

سچ بولنے کے بعد عجب حادثہ ہوا — کاٹی گئی زبان مری بات بات پر (مؤلف)

غار ثور میں ابو بکر کا گریہ اور پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت اور غارِ ثور کے بارے میں مولانا ابو الحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے

Presented by www.ziaraat.com

انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا، یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا جب کہ دشمن گھات میں تھے۔ ایسے سفر میں کوئی صاحب عقل انسان ایسے شخص کو اپنا رازدار و دمساز نہیں بنا سکتا جس پر اُس کو مکمل بھروسہ نہ ہو جب کہ معلوم ہو کہ قدم قدم پر خطرہ تھا، تلاش کرنے اور تعاقب کرنے والوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس وقت سفر میں اسی کو ساتھ لیا جاتا ہے جو اپنی جان اور زندگی سے زیادہ اپنے محبوب و آقا رفیق کو عزیز رکھتا ہو۔" (المرتضیٰ ص ۱۰۱)

پھر فرماتے ہیں؛

"اس کارنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔

"(اس وقت) دو ہی شخص تھے، جن میں (ایک ابو بکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔ اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے" (سورۂ توبہ۔ ۴۰)

یہ وہ مدح ہے جس میں ابو بکر کا کوئی سہیم و شریک نہیں" (المرتضیٰ ص ۱۰۲)

یہ ضروری نہیں ہے کہ محض اعتماد ہی کی بنیاد پر کوئی کسی کو اپنا شریک سفر بنائے۔ اکثر مجبوری اور مصلحت کے تحت انسان کو وہ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں چاہتا پھر ایسے حالات میں جب کہ قدم قدم پر جان کا خطرہ لاحق ہو، اس شخص کو ساتھ لیا جاتا ہے جو ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مضبوط، طاقتور، باہمت، جوانمرد، شجاع اور بہادر ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

یقیناً پیغمبر اسلام چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور آپ کے

پاس علیؑ ابن ابی طالبؑ ایسا شجاع و بہادر موجود تھا، جو آپ کے دشمنوں پر تنہا بھاری آپ کا بہترین رفیق سفر، مددگار اور ساتھی تھا، چاہتے تو آپ امیر المومنین کو اپنے ساتھ لے لیتے لیکن علیؑ کو اپنے بستر پر سُلا کر، آپ کا اپنے گھر سے تنہا نکلنا اور سفر ہجرت اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو کسی مددگار، ساتھی یا رفیق سفر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ آپ کو اپنے معبود پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا اور وہی آپ کی حفاظت کر رہا تھا جو تمام کائنات پر غالب اور حاوی ہے۔

حضرت ابو بکر کو، جو غزواتِ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کے کسی محاذ پر نہ ٹھہرے، رسول اللہ صلعم کے اعتماد کا مرکز اور ان کے تحفظ کی ضمانت قرار دینا مولانا ابو الحسن صاحب ندوی کا وہ کارنامہ ہے جس کو نہ عقل تسلیم کر سکتی ہے اور نہ صداقت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔

ہجرت یا غار ثور سے متعلق جو واقعات مورخین نے تحریر کیے ہیں۔ ان سے ہٹ کر ندوی صاحب نے اپنا قیاسی خاکہ الگ مرتب کیا ہے جبکہ اس سلسلے کے واقعات یوں ہیں کہ:۔

کفار مکہ نے دارالندوہ میں جمع ہو کر ابو سفیان کی تجویز کے مطابق قتل رسول ص کا منصوبہ تیار کیا تھا اس پر عملدرآمد کی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تو آپ نے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے فرمایا کہ کفار مکہ نے آج کی شب مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور میرے لیے اللہ کا یہ حکم ہے کہ میں تمھیں اپنے بستر پر سلا کر ہجرت اختیار کروں۔ علیؑ نے دریافت کیا کہ کیا میرے سونے سے آپ کی جان بچ جائے گی پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اللہ کا یہی حکم ہے۔ علیؑ نے کہا کہ مجھے آپ کی سلامتی مطلوب ہے، میری جان جائے یا رہے آپ حکم الٰہی کے مطابق عمل کریں۔ میں آپ کی

Presented by www.ziaraat.com

ردا اوڑھ کر آپ کے بستر پر سونے کے لیے تیار رہوں، رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو گلے سے لگا لیا۔ اہل مکہ کی تمام امانتیں آپ کے سپرد کیں اور آپ کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سلا کر ایک مٹھی خاک اٹھائی اور کفار مکہ کی آنکھوں میں جھونکتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر ہجرت اختیار کیا اور دوسری طرف حضرت علیؑ تمام خطرات سے بے نیاز سر سے پاؤں تک پیغمبری چادر تان کر بستر رسول پر سو گئے۔ جب خلاق کائنات نے یہ منظر دیکھا تو ملائکہ سے فرمایا؛

"تم میں کچھ میرے بندے ایسے بھی ہیں جو میری خوشنودی کی خاطر اپنی جان تک بیچ دیتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بڑا ہی مہربان اور شفقت کرنے والا ہے۔" (البقرہ۔ ۲۰۶)

احیاء العلوم میں امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ شب ہجرت خدا نے جبرئیل اور میکائیل سے فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی۔ اب بتاؤ، تم میں کون ایسا ہے جو اپنی عمر اپنے بھائی کو دے دے۔ مگر دونوں فرشتوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہے۔ تب خدا نے فرمایا کہ میں نے علیؑ اور محمدؐ میں اس رشتے کو قائم کیا ہے اور دیکھو علیؑ نے آج کی شب اپنی زندگی محمدؐ کو دے دی ہے اور دشمنوں کے نرغے میں بے خوف و خطر ان کے بستر پر محو خواب ہیں۔ تم دونوں ابھی زمین پر جاؤ اور علی کی حفاظت کرو۔ خدا کے اس حکم سے دونوں فرشتے زمین پر آئے۔ جبرئیل حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے اور میکائیل پائنتی بیٹھے اور علیؑ سے فرمایا کہ اے نفسِ پیغمبرؐ! خداوند عالم آپ کے اس عمل پر فخر و مباہات کرتا ہے۔" یہ وہ مدح ہے جس میں علیؑ کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔"

الغرض حضرت علی علیہ السلام بستر رسولؐ پر شانِ بے نیازی کے ساتھ جبرئیل و

میکائیل کی نگرانی میں محو خواب تھے اور اللہ کا حبیب اپنے معبود کی حفاظت میں اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

حدودِ مکہ سے باہر نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا جیسے کوئی ناقہ سوار آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ پیغمبرؐ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے، تیز رفتاری کے سبب آپ کا پائے اقدس، پہاڑی علاقہ کی ناہموار زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر سے اس طرح ٹکرایا کہ ساری انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔ لیکن ناقہ سوار کا برابر تعاقب برابر جاری رہا، آخر کار پیغمبرؐ نے آتے ہوئے ناقہ سوار کو بغور دیکھا تو یہ اندازہ ہوا کہ شاید ابو بکر ہیں۔ آپ ٹھہر گئے۔ پیغمبری اندازہ غلط نہیں تھا، تعاقب کرنے والے حضرت ابو بکر ہی تھے (صحیح بخاری ج ۱ حصہ ۳ ص ۶۹) پیغمبرؐ اسلام نے اس اندیشے کے تحت کہ کہیں دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے ابو بکر کو اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ آپ ابو بکر کی منافقت اور ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف تھے اور اس وقت ابو بکر کو چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ غرض کہ مختصر سا سفر طے کر کے آنحضرت ابو بکر کو لیے ہوئے غار ثور تک پہنچے اور بحکمِ الٰہی اس میں داخل ہو گئے۔ صحیح بخاری کے اسی صفحہ میں یہ بھی ہے کہ جس ناقہ پر ابو بکر سوار تھے اس کو پیغمبرؐ اسلام نے بہ قیمت خرید لیا۔ مدارج النبوۃ میں ہے کہ دو سو درہم کی خریدی ہوئی اونٹنی ابو بکر نے وقت اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر پیغمبرؐ کے ہاتھ نو سو درہم کی بیچی اور پیغمبرؐ اسی پر سوار ہو کر غار ثور تک پہنچے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار میں داخل ہو گئے تو بحکم خدا مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا تن دیا، کبوتر نے انڈے دے دیے اور ببول کا ایک درخت بھی پیدا ہو گیا تاکہ دشمنوں کو پیغمبر کی موجودگی پر شک نہ ہو سکے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ عافیت غار میں قیام فرما ہو چکے

Presented by www.ziaraat.com

تھے اور ادھر کفار مکہ ساری رات رسولؐ کے گھر کا محاصرہ کیے، کبھی پنجوں پر کھڑے ہوکر اور کبھی اچک اچک کر آنحضرتؐ کے بستر کی نگرانی کرتے رہے۔ اسی عالم میں رات گذر گئی اور جب صبح ہوئی تو سب کے سب دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور چادر ہٹائی تو اوسان خطا ہوگئے۔ دشمنوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بستر رسولؐ پر علیؑ ہیں۔ گھبرا کر رسول اللہؐ کے بارے میں پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کیا تم نے محمد کو میرے سپرد کیا تھا۔ طبری میں ہے کہ علیؑ تلوار سونت کر کھڑے ہوگئے اور سب گھر سے باہر نکل بھاگے۔

اپنی اس ناکامی کے بعد کفار نے آپس میں مشورہ کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو زندہ پکڑ کر یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلے لیکن ناکام رہے۔ البتہ سراقہ ابن مالک نام کا ایک شخص کھوج لگاتا ہوا کسی طرح غار تک جا پہنچا۔ اس کی آہٹ پر ابوبکر نے اپنے کان کھڑے کیے اور جب انھیں یہ یقین ہوگیا کہ دشمن قریب تر ہے تو اس کو متوجہ کرنے کے لیے آپ نے بہ آواز بلند بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ یقیناً ابوبکر کا یہ جھیب گریہ پیغمبرؐ اسلام کو قتل کرا دینے کے لیے کافی تھا، اگر خدا کا تحفظ نہ حاصل ہوتا، پیغمبرؐ نے ابوبکر سے فرمایا کہ روتا کیوں ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے حضرت ابوبکر کا وہ کارنامہ جسے مولانا ندوی نے بہت عظیم فضیلت سے تعبیر کیا ہے۔

یکم ربیع الاول سنہ ۱۴ بعثت کو پنجشنبہ کی شب میں کفار مکہ نے آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کیا، ۲ ربیع الاول یوم جمعہ کو آغاز سحر سے کچھ پہلے آنحضرت غار ثور میں داخل ہوئے اور ۴ ربیع الاول یکشنبہ تک وہاں قیام فرما رہے اور حضرت

علی علیہ السلام رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آب و غذا پہنچاتے رہے۔

چوتھے روز مولائے کائنات جب کفار کی طرف سے مطمئن ہوئے تو عبد اللہ بن ارقیط اور عامر بن فہیرہ کے ہمراہ سواری لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں غار سے نکال کر عبد اللہ بن ارقیط اور عامر بن فہیرہ کے ہمراہ مع ابوبکر کے مدینہ روانہ کر دیا اور بعد میں آپ بھی اہلِ مکہ کی امانتیں واپس کر کے عورتوں اور بچوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوگئے اور اس طرح خاندان نبوی کی ہجرت مکمل طور پر عمل میں آگئی۔

بانی اسلام کے بارے میں کفار قریش
جو نہ پوری ہو سکی وہ آرزو کرتے رہے (ڈاکٹر محصور نواب)

غار ثور کی نوعیت

مکہ سے داہنی طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلہ پر جبل ثور نامی پہاڑ کی چوٹی پر گیند نما ایک گول پتھر تھا جس میں قدرتی طور پر اندر خول تھا اور اس پتھر میں ڈیڑھ بالشت لمبا اور ڈیڑھ ہی بالشت چوڑا سوراخ تھا جو در تھا۔ خول کے اندر صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک پستہ قد آدمی کھڑا ہو سکے، شب ہجرت پتھر کے اسی خول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ اعجاز نبوت داخل ہوئے تھے اس پہاڑ کی چوٹی سطح زمین سے ایک میل بلند ہے جہاں سے سمندر دکھائی دیتا ہے۔ (تلخیص سیرۃ النبی ص ۱۶۹)

غزوات سے کنارہ کشی اور فرار

مخالفین اور مشرکین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو

Presented by www.ziaraat.com

دفاعی لڑائیاں لڑیں ان کی تعداد باسٹھ[۶۲] ہے۔ جن لڑائیوں میں سرورِ کائنات نے اپنے باوفا اصحاب میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیجا انھیں سریہ کہا جاتا ہے۔ سریوں کی کل تعداد چھتیس[۳۶] ہے، جن میں موتہ بہت مشہور جنگ ہے اور اس جنگ میں حضرت جعفر طیار کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ جن جنگوں میں سرکار دو عالمؐ بہ نفس نفیس شریک ہوئے انھیں غزوہ کہتے ہیں۔ غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے۔ جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کی جنگیں شہرۂ آفاق ہیں۔ ان تمام جنگوں میں خلفائے ثلاثہ کی شرکت اور ان کا میدان چھوڑ کے بھاگنا تاریخ کی ہر مستند اور معتبر کتاب سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی میدانِ جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کو قرآن میں جہنمی قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ:۔

"جب تم کفار سے میدان جنگ میں لڑو تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرو اور جو شخص بھی دورانِ جنگ کفار کی طرف پیٹھ پھیرے گا وہ یقیناً خدا کے قہر و غضب میں آئے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور یقیناً وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔" (انفال۔ ۱۶)

سورہ توبہ میں ارشاد فرمایا کہ:۔

"کیوں قتال نہیں کرتے تم اس قوم سے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسولؐ کے نکالنے کا ارادہ کر لیا اور انھیں لوگوں نے تمھارے ساتھ ابتدا کی، آیا تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو، پس اگر تم مومن ہو تو اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اُس سے ڈرو۔" (سورہ توبہ۔ ۱۳،۱۴)

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ میدان سے بھاگنا نفاق کی علامت ہے۔ مولوی عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تحریر فرمایا ہے کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا کفر ہے۔

غالباً یہی سبب ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنی کتاب المرتضیٰ میں بدر، احد، خندق اور خیبر کے واقعات بیان کرتے وقت خلفائے ثلاثہ میں سے کسی کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ مولانا کا یہ فعلِ غلط دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ لیکن ع

نمک حلال کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں

بہرحال مجبوریاں کچھ سہی، مولانا ندوی کی تاریخی بددیانتی کا تقاضہ یہی ہے کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کے واقعات کو اجمالی تفصیل کے ساتھ دوبارہ تحریر کیا جائے تاکہ جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔

جنگ بدر

کفر اور اسلام کے درمیان جنگِ بدر پہلی جنگ ہے جو ماہ رمضان ۲ھ میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا لشکر کل تین سو تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ صرف دو عدد گھوڑے تھے۔ ایک پر حضرت مقداد سوار تھے، دوسرا مرثد کی سواری میں تھا، باقی لوگ پیدل تھے۔ کل چھ مجاہدین کے پاس زرہیں تھیں باقی سب لوگ بغیر زرہ کے تھے۔ دوسری طرف لشکر کفار میں زرہ پوش اور ہتھیار بند سوار تھے۔ لشکر اسلام کی علم برداری حضرت علیؑ کے سپرد تھی۔

جنگ کا حال مورخین نے یوں بیان کیا ہے کہ کفار مکہ کا ایک قافلہ ابوسفیان اور عمرو عاص کی قیادت میں سامان تجارت لے کر شام سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو دی گئی اور جہاد کا حکم ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مختصر سا لشکر آنحضرتؐ کی سربراہی میں ان کافروں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ابوسفیان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ گھبرایا اور اس نے مکہ سے کفار کو اپنی مدد کے لیے

Presented by www.ziaraat.com

طلب کیا۔ جب مکہ والوں میں یہ خبر عام ہوئی تو وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ ابوجہل نے یہ منادی کرادی کہ ابوسفیان اور اس کے ہمراہی سب خطرے میں ہیں اور تم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کا مال اس قافلے میں نہ ہو۔ اس منادی کے ہوتے ہی کفار مکہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ ایک لشکر لے کر ابوسفیان کی مدد کو روانہ ہوئے۔ ابوسفیان اپنی چالاکی سے عام راستہ سے ہٹ کر، کسی دوسرے راستے سے مکہ کی طرف نکل گیا اور مکہ سے آئے ہوئے لشکر کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں ہی اپنی بزدلی کی وجہ سے اس جنگ کے مخالف تھے اور مسلمان بھی اپنی قلت پر گھبرا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سعد بن معاذ اور مقداد وغیرہ نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا، اور کہا کہ ہماری جانیں اللہ اور اس کے رسول کے لیے وقف ہیں ہم جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنے ثبات قدم سے کچلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غرض کہ جنگ کی ٹھہری۔ کفار کا لشکر ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا لیکن اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ کفار کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر ہی قید ہوئے۔ قیدیوں میں نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط قتل کر دیے گئے۔ باقی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس جنگ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تنہا چھتیس کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ابوجہل، اس کا بھائی عاص اور عتبہ، شیبہ، ولید بن عتبہ و نیز اسلام کے بہت سے دشمن مارے گئے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ اس جنگ میں موجود تھے مگر نہ جانے کہاں روپوش تھے کہ انھوں نے جنگ ہی نہیں کی، اس جنگ کے بعد کفار کا ہر ایک گھر ماتم کدہ بن گیا اور مقتولین کے انتقام کا جذبہ مکہ کے ہر پیر و جوان میں پیدا ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں احد کا معرکہ ہوا۔

جنگ احد

یہ جنگ ۱۵ ر شوال ۳ھ کو ہوئی۔ اس کی روداد یہ ہے کہ جنگ بدر کی شکست سے کفار مکہ کے دلوں میں غم و غصہ اور انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ابوسفیان نے مقتولین بدر کے ورثا کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی عورتوں کو رونے نہ دیں ورنہ آنسو نکلنے سے غم و غصہ کم ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ جنگ بدر کا بدلہ لینے کی غرض سے ابوسفیان تین ہزار سواروں، دو ہزار پیادوں اور مقتولین بدر کی عورتوں کے ہمراہ مکہ سے نکلا اور مدینہ سے چار میل کے فاصلے پر کوہ احد کے دامن میں خیمہ زن ہو گیا۔

یہ خبر پیغمبرؐ کو موصول ہوئی تو آپ بھی ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کو نکلے اور میدان میں پہنچ کر آپ نے عبداللہ ابن جبیر کو پچاس تیر اندازوں پر مشتمل ایک دستے کا افسر معین کیا اور اس بات کی سخت تاکید فرمادی کہ لشکر اسلام کو خواہ فتح حاصل ہو یا شکست لیکن تیر اندازوں کا یہ دستہ اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹے گا۔ اس ہدایت کے بعد آنحضرتؐ نے اسلامی لشکر کو کفار کے مقابلہ میں صف آرا کیا اور رفتہ رفتہ معرکۂ کارزار گرم ہونے لگا۔ مسلمانوں کے سخت حملوں نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیے اور اسلامی فوج عنقریب کامیابی سے ہمکنار ہونے ہی والی تھی کہ عبداللہ ابن جبیر کا دستہ مال غنیمت کی لالچ میں پیغمبرؐ کے تاکیدی حکم کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ گیا اور جس کا انجام ہوا کہ حاصل ہوتی ہوئی فتح اور کامرانی شکست میں تبدیل ہوگئی اور میدان میں بھگدڑ مچ گئی۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ تو اس طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے کہ انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گذر رہی

Presented by www.ziaraat.com

ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ حضرت عثمان بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ در منثور ج ۲ ص ۸۸ اور کنز العمال ج ۱ ص ۲۳۸ میں ہے کہ ابوبکر بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ اور خود حضرت ابوبکر کا کہنا ہے کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح اچک رہا تھا جیسے پہاڑی بکری اچکتی ہے۔

اس جنگ میں ستّر مسلمانوں کے ساتھ حضرت حمزہؓ بھی شہید ہوئے اور معاویہ کی ماں ہندہ نے آپ کا کلیجا نکال کر چبایا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے جسم اقدس پر سولہ زخم آئے اور آپ کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی زخمی ہوئی اور آپ کے دو دانت شہید ہو گئے۔ اسی جنگ میں امیر المومنین کو لافتیٰ الا علی کی سند کے ساتھ ذوالفقار عطا ہوئی اور ایک روایت کے مطابق نادِ علی کا نزول بھی اسی جنگ میں ہوا۔ (طبری ج ۲ ص ۶۰۴، تاریخ کامل ج ۲ ص ۵۵)

جنگ خندق

یہ جنگ ماہ ذیقعدہ ۵ھ میں ہوئی۔ اس جنگ کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ مدینہ سے جلا وطن کیے ہوئے یہودی جو خیبر کے آس پاس سکونت پذیر ہو گئے تھے، رات دن اسی فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں سے کیونکر بدلہ لیا جائے چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ مکہ گئے اور ابوسفیان سے مل کر، قبیلۂ بنی غطفان اور دیگر قبائل کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں اور مختلف قبائل کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ تمام قبیلوں کے بہادر اور سورما مل کر مدینہ پر ایک ساتھ حملہ کر کے اسے برباد و تاراج کر دیں کہ جس سے اسلام کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

اس معاہدہ کے تحت، ابوسفیان مکہ سے چار ہزار کا لشکر لے کر نکلا،

اور یہودیوں نے دیگر قبائل کے ساتھ چھ ہزار کے لشکر سے پیش قدمی کی۔ غرض کہ دس ہزار کا یہ جم غفیر مدینہ پر حملہ کی نیت سے آگے بڑھا۔ پیغمبر اسلامؐ بھی مدینہ سے نکلے اور کوہِ سلع کو پشت پر لے کر جناب سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے پندرہ فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ گہری ایک خندق کھدوائی۔ خندق کی [illegible] آنحضرتؐ خود بھی کمال جاں فشانی اور محنت کے ساتھ لگے رہے۔

اس جنگ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں بھی جاری تھیں اور اندرونی خلفشار بھی تھا۔ جلال الدین سیوطی کا کہنا ہے کہ تحفظ کے پیش نظر آنحضرتؐ نے دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر گیری کے لیے ابوبکر اور عمر کو مامور کرنا چاہا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا تو آپؐ نے حذیفہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ (در منثور ج ۵ ص ۱۸۵)

خندق کی تیاری کے تیسرے ہی دن کفار کا لشکر آدھمکا اور دشمنوں کی کثرت دیکھ کر مسلمانوں میں تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔ آنحضرت نے ثابت قدمی کی ہدایت فرمائی اور ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔ جلال و ہیبت پیغمبری سے دشمنوں میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ یکبارگی حملہ کی ہمت و جسارت کرتے۔ اس کے علاوہ بھی دشمنوں کو اس امر کا بخوبی علم تھا کہ لشکر اسلام میں علیؑ ایسا تلوار کا دھنی، شجاع اور بہادر موجود ہے۔ اس لیے اکّا دُکّا خندق پار کر کے مسلمانوں پر حملہ کی کوشش کرتا رہا اور یہ سلسلہ ستائیس ۲۷ دن تک برابر جاری رہا۔ آخر کار عمرو بن عبدِ وُد جو طاقت اور بہادری میں تنہا ایک ہزار جوانوں کے برابر سمجھا جاتا تھا ایک دن خندق پھاند کر خود ہی مقابلے میں آگیا اور اس نے ھل من مبارز کی صدا بلند کی۔ عمرو بن عبدود کی آواز سن کر حضرت ابوبکر اور عمر کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ خوف و دہشت کے مارے تھرتھرانے لگے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس دیو پیکر سے کون لڑ سکتا ہے جو ایک ہزار قزاقوں سے تنہا مقابلہ کرتا ہے۔ خدا کی قسم

Presented by www.ziaraat.com

میں ایک سفر میں ایک بار اس کے ساتھ تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر رات کے وقت حملہ کر دیا۔ عمرو ابن عبدود اس وقت سو رہا تھا، اسے جگایا گیا، جلدی میں اسے ڈھال نہ مل سکی تو ڈھال کی جگہ اس نے اونٹ کا ایک بچہ اٹھا لیا اور قزاقوں پر حملہ کر کے انھیں بھگا دیا۔

حضرت عمر کے اس بزدلانہ بیان نے مسلمانوں کو اور بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ نے لشکر اسلام کو مخاطب کر کے مقابلہ کی ہمت دلائی لیکن ایک بہادر نوجوان کے علاوہ کوئی نہ سنکا۔ تاریخ خمیس، روضۃ الاحباب اور روضۃ الصفا میں ہے کہ تین بار آنحضرت نے اپنے صحابہ (ابوبکر اور عمر وغیرہ) سے مقابلہ کے لیے کہا، لیکن یہ لوگ چپ رہے اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بزدلوں کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں۔ صرف ایک علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر بار بار لبیک کہہ رہے تھے۔

جب صحابہ میں کوئی تیار نہ ہوا تو پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کو اجازت دی اور انھیں اپنی زرہ پہنا کر اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا۔ اپنی تلوار مرحمت کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ پالنے والے، جنگ بدر میں عبیدہ اور جنگ احد میں حمزہ کو تیری بارگاہ میں نذر کر چکا ہوں اور اب میرے پاس صرف علیؑ رہ گئے ہیں، مالک! تو ان کی حفاظت فرما، اور جب علی مرتضیٰ آپؐ کی دعاؤں کے سائے میں عمرو ابن عبدود سے جنگ کے لیے چلے تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو آج کُلِ ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ (حیواۃ الحیوان ج ۱ ص ۲۳۸ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲)

حضرت علی علیہ السلام عمرو ابن عبدود کے مقابل ہوئے اور جنگ شروع ہوئی، عالم یہ تھا کہ گرد و غبار کے پردے میں صرف دو تلواریں تھیں جو چمکتی ہوئی

دکھائی دیتی تھیں، اس کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حضرت علیؑ نے جب نعرہ تکبیر بلند کی تو مسلمانوں کو اطمینان ہوا کہ عمرو پر علیؑ غالب آگئے۔ پیغمبر اسلام نے عمرو ابن عبدود کے قتل کی خبر سنی تو فرمایا کہ آج کے دن علیؑ کی ایک ضربت عبادت ثقلین سے بہتر ہے۔

عمرو بن عبدود کے قتل ہوتے ہی اس کے تمام ساتھی خندق پھاند کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر کیا تھا، حضرت علیؑ نے کفار کے لشکر میں گھس کر دشمنوں کو تلوار کی باڑھ پر لے لیا اور یہ جنگ اللہ کی مدد اور علیؑ کی قوت سے سر ہوئی۔ اس جنگ میں حضرات شیخین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے جسم پر ایک خراش تک نہ آنے دی۔ (تاریخ احمدی ص ۵۰ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲)

بعض کتابوں میں ہے کہ عمرو ابن عبدود کے سینے پر چڑھ کر حضرت علیؑ اس کا سر کاٹنا چاہتے تھے کہ اس نے لعاب دہن سے چہرۂ اقدس پر بے ادبی کی۔ حضرت کو غصہ آگیا لیکن آپ یہ سوچ کر فوراً سینے سے اتر آئے کہ کارِ خدا میں جذبۂ نفس شامل ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب غصہ فرو ہوا تو آپ نے سر کاٹا اور زرہ اتارے بغیر رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے علیؑ کو سینے سے لگایا۔

بروایت سلیمان قندوزی جبرئیل امین نے آسمان سے انار لا کر تحفہ عنایت کیا۔ انار کے ساتھ ایک سبز رنگ کا رومال بھی تھا جس پر "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہ" لکھا تھا۔

جنگ خیبر

یہ جنگ سنہ ۷ھ میں ہوئی۔ خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً پچاس میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں کے سرکش یہودیوں نے باہم متحد ہو کر قبیلۂ بنی اسد اور بنی غطفان کی مدد سے مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا

Presented by www.ziaraat.com

چنانچہ یہودیوں کے اس منصوبہ کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا تو آپ چودہ سو پیادوں اور دو سو سواروں کا ایک لشکر لے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۴ر صفر ۷ھ کو خیبر میں پہنچ کر اس کا محاصرہ کیا۔ خیبر میں یہودیوں کی جو سب سے بڑی پناہ گاہ تھی وہ قلعۂ قموص کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس جنگ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر بھی مردانگی سوار ہوئی اور یہ لوگ بھی میدان کارزار میں گئے، لیکن مرحب و عنتر وغیرہ نے انھیں دوڑایا تو بہادری اور مردانگی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ حضرت عمر دو بار مقابلہ کے لیے نکلے۔ لیکن جب کھدیڑے گئے تو آپ نے بھاگ کر سیدھے اپنے خیمہ میں دم لیا۔ مستدرک حاکم، تاریخ طبری ج ۳ ص ۹۳ تاریخ احمدی ص ۵۹ اور شواہد النبوۃ ص ۸۵ وغیرہ میں مرقوم ہے کہ حضرت عمر نے اپنی اس کھسیاہٹ کے تحت لشکر اسلام کو بزدل قرار دیا اور لشکر اسلام نے انھیں بزدل ٹھہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دوران درد شقیقہ میں مبتلا تھے اور اپنی اس ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ میدان جنگ مسخروں اور بھگوڑوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں کل اپنے ہاتھوں سے علم اس کو دوں گا جو کرار اور غیر فرار ہوگا اور وہ خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ وہ دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہوگا اور میدان جنگ سے اس وقت تک نہ پلٹے گا جب تک قلعۂ قموص فتح نہ ہو جائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان سے بزدلوں اور بھگوڑوں کے دلوں میں اس خواہش نے سر اٹھایا کہ شاید رسولؐ کی نگاہ انتخاب ان کی

جانب ملتفت ہو جائے اور پیغمبرؐ سے ملنے والی یہ سعادت ان کے ہی حصہ میں آجائے اس لیے ان لوگوں نے بے خوابی کے عالم میں کسی طرح رات کاٹی اور جب صبح ہوئی تو سرداری کا حوصلہ دل میں لیے رسولؐ کے خیمہ کا طواف کرنے لگے کہ علم مل جائے۔ لیکن اس وقت ان کا یہ سنہرا خواب چکنا چور ہو گیا جب زبانِ رسالت مآبؐ پر حضرت علیؑ کا نام آیا۔ فوراً بڑھ کر ایک نے کہا کہ حضور! علیؑ تو آشوب چشم میں مبتلا ہیں وہ جنگ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ ابھی یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام خدمت رسولؐ میں آتے دکھائی دیے۔ پیغمبرؐ نے امیر المومنین کو بڑھ کر گلے لگایا اور آپ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آپ کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا جس سے آپ کا آشوب چشم جاتا رہا اور بخار بھی اتر گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے علم حضرت علیؑ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ جا کر قلعۂ قموص کو فتح کرو۔ امیر المومنین نے دریافت فرمایا کہ کب تک جنگ کروں، رسول نے فرمایا کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی سابقہ شان شجاعت کے ساتھ میدان میں آئے اور علم کو ایک پتھر پر گاڑ دیا۔ یہ منظر ایک یہودی دیکھ رہا تھا اس نے بڑھ کر امیر المومنین سے آپ کا نام دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ یہ سننا تھا کہ وہ یہودی اپنی جان لے کر بھاگا اور قلعہ میں پہنچ کر یہودیوں سے بولا کہ خدا کی قسم آج ہم سب مارے جائیں گے کیونکہ اس قلعہ کے فاتح کے جو اوصاف توریت میں بیان ہوئے ہیں وہ سب علیؑ میں موجود ہیں۔

الغرض جنگ چھڑی اور معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ حارث، عنتر، ربیع اور

Presented by www.ziaraat.com

مرحب جیسے نامی وگرامی پہلوان ذوالفقار حیدری کی زد میں آئے اور موت کے گھاٹ اتر گئے۔ بالآخر یہودیوں میں بھگدڑ مچی اور بھاگتے بھاگتے ایک یہودی نے امیرالمومنینؑ کے ہاتھ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ڈھال آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ شیر ذوالجلال کو جلال آیا اور آپ نے قلعہ کے آہنی دروازہ پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر زور دیا تو انگلیاں باب خیبر میں اس طرح در آئیں کہ جس طرح موم میں لوہا در آتا ہے۔ وہ دروازہ جسے چالیس پہلوان مل کر جنبش نہ دے سکتے تھے، ایک جھٹکے میں ہاتھوں پر اس طرح آگیا کہ جیسے کوئی شاخ سے پھول توڑلے۔

درخیبر کو آپ نے ڈھال کی جگہ استعمال کرکے دشمنوں سے جنگ کی اور پھر اسی کا پل بنا کر اسلام کی فوج کو قلعہ کے اندر داخل کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں کو شکست ہوئی اور لشکر اسلام ظفریاب ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام قلعہ قموص فتح کرنے کے بعد کامیابی وکامرانی کا تاج پہنے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس پلٹے۔

روضۃ الصفا میں باب خیبر کا وزن تین ہزار من بتایا گیا ہے۔ چونکہ اس در کا اکھاڑنا قوت انسانی سے باہر تھا اس لیے امیرالمومنینؑ نے یہ وضاحت بھی فرما دی تھی کہ میں نے باب خیبر کو قوت ربانی سے اکھاڑا ہے۔

طبری ج ۳ ص ۹۳ میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ سرداری کا جیسا حوصلہ مجھے خیبر میں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہوا.....

نوٹ :۔ تاریخ کی کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کسی جنگ کے موقع پر رسول خداؐ نے حضرات شیخین کے سپرد علم کیا ہو۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میدانِ کارزار میں علم اس کو دیا جاتا ہے جو فن حرب میں مہارت اور میدان جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ بھلا شیخین کو فن حرب سے کیا تعلق ؟ جبکہ حضرت ابوبکر ایک معمولی بزاز

کے بیٹے اور حضرت عمر ایک غریب ومزدور پیشہ لکڑہارے کے فرزند تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ سیرسپل کی غرض سے خیبر میں بزعم خود علم لے بھاگے ہوں اور مرحب وغیرہ نے کھدیڑ کر انھیں خیمہ تک پہنچا دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

جنگ حنین

یہ جنگ ۶ شوال ۸ھ میں لڑی گئی۔ حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے طائف کی سمت تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس جنگ کا تاریخ میں ایک اہم مقام ہے لیکن مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اس جنگ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس جنگ کے حالات بیان کرنے سے وہ رازہائے سربستہ منکشف ہوتے ہیں جنھیں مولانا ندوی نے پردے میں چھپانا چاہا ہے اور ان لوگوں کا فرار ثابت ہوتا ہے جو سیف اللہ کہے جاتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اس جنگی تسلسل کے آخر میں اس جنگ کی بھی اجمالی تفصیل پیش کی جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ :۔

فتح مکہ کے بعد، قبیلہ بنی خشم، بنی سعد، بنی ہوازن اور بنی ثقیف وغیرہ نے ایک اجماع میں یہ فیصلہ کیا کہ سب مل کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اس تجویز کے بعد سب قبیلوں نے متفقہ طور پر اپنا سردار مالک بن عوف کو مقرر کیا اور لشکر کی علمبرداری ابوجرول کے سپرد کی گئی اور یہ لوگ پانچ ہزار کا ایک لشکر لے کر حنین اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر جمع ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار کے لشکر کے ہمراہ جس میں ڈھائی ہزار نومسلم بھی شامل تھے مقابلہ کے لیے نکلے۔ حسب معمول حضرت علیؑ اسلامی لشکر

کے علمبردار تھے۔ جب لشکر میدان میں پہنچا تو حضرات شیخین کو اپنی کثرت اور دشمنوں کی قلت پر ایسا گھمنڈ ہوا کہ فرمانے لگے، آج ہم تعداد میں اس قدر ہیں کہ دشمنوں کو پیس کر رکھ دیں گے۔

شیخین کا یہ غرور اور گھمنڈ شاید اللہ کو بھی ناگوار گذرا اور ابھی یہ دونوں برادران اپنی کثرت پر ناز فرما ہی رہے تھے کہ پہاڑوں میں چھپے ہوئے دشمنوں نے تیروں اور پتھروں سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ بزدلوں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ جنگ کی بساط الٹتے ہی یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں میں چھوڑ کر اس طرح بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ رسول اللہ آوازیں دیتے رہے کہ اے بیعت رضوان والو! کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ لیکن پیغمبر اسلام کی یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح گونجتی رہی اور بھاگنے والے بھاگتے رہے۔

حبیب السیر اور روضۃ الاحباب میں ہے کہ بھاگنے والوں میں سب سے پہلے خالد بن ولید (سیف اللہ) بھاگے، ان کے پیچھے نو مسلم تھے۔ ان کے پیچھے ابوبکر، ان کے پیچھے عمر اور عثمان وغیرہ، ان کے پیچھے انصار و مہاجر بھاگے۔ غرضکہ بزدلوں کی یہ میل ٹرین بزدلی کی پٹڑی پر تیزی سے بھاگ رہی تھی اور خالد بن ولید جنھیں سیف اللہ کہا جاتا ہے انجن کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ الغرض رسول اسلام کے تحفظ میں علیؑ بن ابی طالبؑ، عباس، زید بن حارث اور ابن مسعود کے علاوہ کوئی نہ ٹھہرا۔ (سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۱۰۹)

حالات کی نزاکت کے پیش نظر رسول اللہ نے بذات خود جنگ کا ارادہ کیا لیکن عباس نے بڑھ کر لجام فرس تھام لی اور بھاگتے ہوئے لوگوں کو پکار پکار کر انھیں شرم و غیرت دلائی۔ عباس کی آواز پر تقریباً سو آدمیوں کا ایک دستہ

پلٹ کر آیا اور دشمن بھی پہاڑوں سے نکل کر مقابل ہو گئے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی ابو جرول جو کفار کے لشکر کا علمبردار تھا، حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا قتل ہونا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے یک بارگی بڑھ گئے اور آخر کار اللہ نے حضرت علیؑ کے توسل سے اس جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کی۔

یہ ہیں حضرات ابوبکر اور عمر وغیرہ کے قابل فخر جنگی کارنامے جو تاریخی حیثیت سے مستند اور مسلم ہیں۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی یا ان کے مسلک کے حضرات اپنے ان مذہبی پیشواؤں اور دینی مقتداؤں کے ان کارناموں پر جس قدر بھی ناز فرمائیں بجا ہے

صلح حدیبیہ اور ابوبکر کی گالیاں

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب میں صلح حدیبیہ کے حالات کی تفصیل بیان کرتے وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی موجودگی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ان کی اس گفتگو کو بیان کیا ہے جو تاریخ ساز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ ان واقعات کو پیش کر دوں جنھیں مولانا نے قصداً نظرانداز کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

ماہ ذیقعدہ سنہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لیے روانہ ہوئے اور راستے میں ایک کنوئیں کے پاس قیام فرمایا جس کا نام حدیبیہ تھا۔ وہاں آپ نے اپنے تمام اصحاب سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اسی بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب سمرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے لیے مکہ کا ماحول سازگار نہیں تھا اس لیے قریش کے خصوصی ایلچی عروہ نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ اس سال آپ حج سے باز آئیں۔ اول تو مکہ کا ماحول درست نہیں ہے۔ دوسرے میں آپ کے گرد ایسے غلط اور

Presented by www.ziaraat.com

اوباش لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو وقت پڑنے پر آپ کو چھوڑ کے بھاگ جائیں گے عروہ چونکہ شیخین کی بزدلی سے باخبر تھا اس لیے اس کا یہ مشورہ کسی حد تک درست بھی تھا لیکن حضرت ابو بکر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور وہ آپے سے باہر ہو گئے اور آپ نے گالیوں کی بوچھار شروع کر دی۔ فرمایا کہ جا اور جا کر اپنے معبود (لات وہبل) کی شرمگاہ چوس اور اس کے بظر آلات کا مزہ لے۔ کیا ہم ایسے ہیں کہ رسول کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

(تجرید بخاری، حدیث ۸۹۷، شرح زرقانی ص ۱۹۱۲ اور روضۃ الاحباب ص ۲۱۵ وغیرہ)

حضرت ابو بکر کے اس طرز عمل سے واضح ہے کہ آپ گالیوں کے ایسے مجتہد تھے کہ آپ کو پیغمبر کی موجودگی کا بھی کوئی ادب، احترام یا لحاظ نہیں تھا۔

تاریخ ابن اثیر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ سے مصالحانہ گفتگو کی غرض سے ابو بکر اور عمر کو مکہ روانہ کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے جانے سے انکار کیا تو آپ نے عثمان کو بھیجا۔ حضرت عثمان چونکہ ابو سفیان کے بھتیجے تھے اس لیے کفار سے انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا لہٰذا وہ گئے اور گفتگو کے بعد مصالحت کا معاہدہ ضابطۂ تحریر میں آیا لیکن اس کی صورت یہ نہیں تھی جسے مولانا ندوی نے ظاہر کیا ہے۔

تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۵ اور درمنثور ج ۶ ص ۷۷ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر نے فرمایا کہ محمدؐ کی نبوت میں جیسا شک آج مجھے ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

حضرت عمر کے اس قول ہی سے ظاہر ہے کہ وہ محمدؐ کی نبوت کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا کیے لیکن حدیبیہ میں موصوف کا شک شاید ان کی یقین کی منزلوں میں داخل ہو چکا تھا۔ جب کہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ رسول اللہؐ صلعم کی

کی رسالت پر شک کرنے والا کافر اور رسول اللہؐ کو صدمہ پہنچانے والا جہنمی ہے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے اس طرز عمل سے رسول اللہؐ بے حد ملول اور کبیدہ خاطر ہوئے۔ (تاریخ ابن خلدون ۳۶)

ابوبکر سے رسولؐ اللہ کی بیزاری

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ وقت آخر آنحضرت نے مجھ سے فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ، میں نے اپنے باپ ابو بکر کو بلایا جب وہ آئے تو آپ نے ان کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیا اور ان سے کوئی کلام نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ، دوسری بار میں نے عمر بن خطاب کو بلایا آپ نے ان سے بھی کوئی کلام نہ کیا اور جب تیسری بار پھر فرمایا تو میں نے علیؑ ابن ابی طالب کو بلایا جب وہ آئے تو آپ نے انھیں اپنی چادر میں لے لیا اور وقت آخر تک انھیں اپنے سینے سے لگائے رہے۔ (ریاض النضرہ ص ۱۸۰)

روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۵ تاریخ بغداد ص ۲۹۰ اور مدارج النبوہ ج ۲ ص ۵۱۱ میں مرقوم ہے کہ آنحضرتؐ نے سیدہؑ اور حسنینؑ کو بھی طلب فرمایا تھا اور انھیں یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد تمھیں سخت مصائب و آلام کا سامنا ہوگا مگر تم صبر کرنا اور جب اہل دنیا، دنیا پرستی کریں تو تم دین اختیار کیے رہنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت

المرتضیٰ کے فاضل مولف مولانا ندوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افسوس ناک شہادت کو وفات سے تعبیر کیا ہے جبکہ الوافی ج ۱ ص ۶۶ بحوالہ تہذیب الاحکام، سر العالمین طبع مطبع بمبئی ۱۳۱۴ھ ص ۷، صحیح بخاری مطبوعہ مصر

Presented by www.ziaraat.com

ج ۳ باب اللدود، کتاب الطب اور مشکوٰۃ شریف باب ۳ ص ۵۸ وغیرہ میں موجود ہے کہ مدینہ میں دوران علالت پیغمبر اسلام کو بستر علالت پر ہی زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

زہر دینے والا کون تھا؟ اس کی صراحت مذکورہ کتابوں میں نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر نہیں کی گئی یا نہیں رہ گئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دورانِ علالت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر مرض حضرت عائشہ کے قبضہ میں تھا، جیسا کہ انگریز مورخ اور ادیب مسٹر گبن کا کہنا ہے کہ،
"رسول کا بستر عائشہ جیسی چالاک عورت کے محاصرے میں تھا جو ابو بکر کی بیٹی اور علیؑ کی سخت دشمن تھیں۔" (تاریخ عروج وزوال سلطنت روم ص ۹۲۸)

حضرت عائشہ کا رویہ یقیناً امیر المومنین سے ہمشہ معاندانہ رہا اور اکثر ان کے دل کی کدورت ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی اور ان کے طرز عمل سے نفرت و بیزاری جھلک اٹھتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کسی واقعہ کے سلسلے میں حضرت علیؑ کا نام آجاتا تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس نفرت و عناد کا ایک خاص سبب جناب فاطمہ زہرا کا وجود بھی تھا جن کی ہمہ گیر عظمت و توقیر ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور سوتاپے کی جلن یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ پیغمبر اسلام، سوت کی دختر کو اس طرح چاہیں کہ اسے دیکھتے ہی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اپنی مسند پر جگہ دیں اور سیدۃ النساء العالمین کہہ کر دنیا کی تمام عورتوں پر اس کی فوقیت ظاہر کریں اور اس کی اولاد کو اس حد تک عزیز رکھیں کہ انھیں اپنا فرزند کہہ کر پکاریں۔ یہ تمام چیزیں حضرت عائشہ پر شاق گذرنے والی تھیں اور فطری طور پر ان کے جذبات اس موقع پر یہی ہونگے کہ اگر خود ان کے بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو وہ پیغمبر کے بیٹے کہلاتے اور بجائے

حسنینؑ کے وہ آپ کی محبت کا مرکز بنتے مگر ان کی گود اولاد سے ہمیشہ ہی خالی رہی اور ماں بننے کی آرزو کو اپنے بھانجے کے نام پر اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ کر پورا کر لیا۔ غرض یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے عائشہ کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا جس کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپ جناب سیدہ کے خلاف پیغمبر سے شکوہ و شکایت بھی کرتی رہتی تھیں۔ مگر آنحضرت کی توجہات ان کی طرف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس رنجش و کشیدگی کا تذکرہ حضرت ابو بکر کے کانوں میں بھی برابر پہنچتا رہتا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے تھے۔ مگر ان کے کیے بھی کچھ نہ ہو پاتا تھا سوا اس کے کہ ان کی زبانی ہمدردیاں اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کو دنیا سے رخصت کیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی۔ اب موقع تھا کہ وہ جس طرح چاہتے انتقام لیتے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے اور جو تشدد چاہتے فاطمہ زہراؑ کے لیے روا رکھتے۔ چنانچہ پہلا قدم یہ اٹھایا کہ جناب سیّدہ کو محروم الارث قرار دینے کے لیے آپ نے پیغمبروں کے ورثہ کی نفی کر دی کہ نہ وہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی وارث ہوتا ہے بلکہ ان کا ترکہ حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ ابو بکر کے اس طرز عمل سے جناب فاطمۃ الزہراؑ اس قدر متاثر ہوئیں کہ آپ نے ترک کلام کر دیا اور انھیں تاثرات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ حضرت عائشہ نے اس موقع پر بھی اپنی روش نہ بدلی اور یہ تک گوارا نہ کیا کہ ان کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید کا کہنا ہے کہ "جب حضرت فاطمہ زہراؑ نے رحلت فرمائی تو تمام ازواج پیغمبر بنی ہاشم کے یہاں تعزیت کے لیے پہنچ گئیں سوا عائشہ کے کہ وہ نہ آئیں اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مریض ہیں اور ان کی طرف سے حضرت علی کے کانوں میں ایسے الفاظ پہنچے جن سے ان کی مسرت و شادمانی کا پتہ چلتا ہے"
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲ ص ۴۵۹)

Presented by www.ziaraat.com

جب جناب سیدہ سے اس حد تک دشمنی تھی تو جن سے آپ کا دامن وابستہ تھا وہ حضرت عائشہ کی دشمنی اور عناد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا جبکہ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے رہے ہوں جو اس مخالفت کو ہوا دیتے اور جذبۂ نفرت کو ابھارتے رہے ہوں۔ جیسے واقعۂ افک کے سلسلے میں حضرت علی کا پیغمبرؐ سے یہ کہنا کہ "یہ تو آپ کی جوتی کا تسمہ ہے"۔ اسے چھوڑیے اور طلاق دے کر الگ کیجیے۔

جب حضرت عائشہ نے یہ سنا ہو گا تو یقیناً بے قراری کے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی ہوں گی اور حضرت علی کے خلاف جذبۂ شدت نفرت کے ساتھ آپ کے دل میں ابھرا ہو گا۔ پھر ایسے واقعات بھی پیش آتے رہے کہ ان کے باپ حضرت ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کو امتیاز دیا گیا اور ان کے مدارج کو بلند و نمایاں کر کے دکھایا گیا، جیسے کہ تبلیغ سورۂ برائت کے سلسلے میں پیغمبر کا انھیں معزول کر کے واپس بلا لینا اور یہ خدمت علیؑ کے سپرد کرنا۔ مسجد نبوی میں کھلنے والے تمام دروازے جن میں حضرت ابوبکر کا بھی دروازہ تھا، چنوا دینا اور صرف حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دینا وغیرہ، یہ وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے حضرت علیؑ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عائشہ کا اہل بیت سے جذبۂ نفرت بام عروج پر تھا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ اپنے باپ کے مقابلے میں حضرت علی کا تفوق گوارا نہ کر سکتی تھیں اور جب بھی کوئی امتیازی صورت پیدا ہوتی تو اسے مٹانے کی کوشش اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب پیغمبرؐ نے آخر وقت حضرت اسامہ کے ہمراہ لشکر روانہ کیا اور حضرت ابوبکر اور عمر کو بھی ان کے زیر امارت جانے کا حکم دیا تو ازواج پیغمبرؐ کے ذریعہ انھیں یہ پیغام ملتا ہے کہ پیغمبرؐ کی حالت نازک ہے، لشکر کو آگے بڑھنے کے بجائے پلٹ آنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت عائشہ

اور حضرت ابوبکر کی نظروں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ مدینہ کو مہاجرین و انصار سے خالی کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے بعد علی سے کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور کسی شورش انگیزی کے بغیر آپ منصب خلافت پر فائز ہو سکیں۔ چنانچہ جیش اسامہ اس پیغام پر پلٹ آیا۔ جب پیغمبرؐ نے یہ دیکھا تو اسامہ کو پھر لشکر لے جانے کی تاکید فرمائی اور یہ تک فرما دیا کہ جو شخص لشکر اسامہ سے تخلف کرے گا اس پر خدا کی لعنت ہو گی۔ لشکر روانہ ہوا مگر پھر انھیں واپس بلا لیا جاتا ہے یہاں تک کہ پیغمبرؐ پر نزع کا عالم طاری ہونے لگا لیکن لشکر کو روانہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اس کارروائی کے بعد بلالؓ کے ذریعہ حضرت ابوبکر کو یہ کہلوایا جاتا ہے کہ وہ نماز میں امامت کے فرائض انجام دیں تاکہ ان کی خلافت کا راستہ ہموار ہو جائے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر انھیں خلیفۃ الرسول علی الصلوٰۃ کہہ کر خلیفہ علی الاطلاق مان لیا گیا اور پھر ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ کسی طرح خلافت امیر المومنین تک نہ پہنچ سکے لیکن دور عثمانیہ کے بعد حالات نے اس طرح کروٹ لی کہ لوگ حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عائشہ اس موقع پر مکہ میں تشریف فرما تھیں۔ انھیں جب امیر المومنین کی بیعت کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں سے شرارے برسنے لگے۔ غیظ و غضب نے نسوانی مزاج میں برہمی پیدا کر دی اور دیرینہ نفرت نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ جس خون کے بہانے کا فتویٰ دے چکی تھیں اسی کے قصاص کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ایسا کشت و خون ہوا کہ بصرہ کی سرزمین سرخ ہو گئی اور افتراق انگیزی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھل گیا۔

مولانا ندوی نے اپنی کتاب 'المرتضیٰ' میں ابوبکر کے نماز پڑھانے کا واقعہ بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کو انتہائی

Presented by www.ziaraat.com

فضیلت کا حامل قرار دیا ہے۔ اوّل تو نماز پڑھانے کا یہ حکم رسول اللہ صلعم کا نہیں بلکہ آپ کی بیٹی حضرت عائشہ کا تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے باپ کی خلافت کا راستہ ہموار کر رہی تھیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ علمائے اہل سنت کے نزدیک اسلام میں امامت نماز کی کچھ اہمیت اور فضیلت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر ہو یا گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ کرتا ہو" (دیکھیے مشکوٰۃ المصابیح باب الامامت)

جب فاضل مولف کے علماء کے نزدیک ایک فاسق، فاجر اور گناہ کبیرہ کے مرتکب انسان کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے تو پھر حضرت ابوبکر کو فضیلت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ حضرت ابوبکر کا یہ سازشی عمل اس قابل ہے کہ اس کو موضوع بحث قرار دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شہادت کے باب میں جو وضاحت پیش کی گئی وہ اہم اور ضروری تھی۔ اب ہم پھر رہوار قلم کو موضوع شہادت کی طرف موڑتے ہیں تاکہ گفتگو نا تمام نہ رہے۔

۲۸ صفر ۱۱ھ کا دن عالم اسلام میں قیامت کی طرح نمودار ہوا جب اللہ کے آخری رسولؐ نے زہر سے لبریز جام شہادت نوش فرما کر اپنے معبود کو لبیک کہا ملک الموت نے آپ کے خلعت ظاہرہ کو اتار کر حلۂ بہشت پہنایا۔ بزم انبیاء اور صف ملائکہ سے اناللہ وانا الیہ راجعون کا شور بلند ہوا۔ دین اسلام نے فرش غم بچھایا اور شریعت مصروف ماتم ہو گئی۔

ایک طرف اہل بیت اطہار میں کہرام تھا تو دوسری طرف کچھ سفاک چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ اس غم واندوہ کے ماحول اور کرب و اضطراب کے عالم میں فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول کی عقیدت و محبت کا دم بھرنے والے اور

بزم ادب آموز میں بیٹھنے والے آلِ رسولؐ کے غم زدہ دلوں کے زخموں پر تسلی کا مرہم رکھتے اور انھیں ہر طرح کا دلاسہ دیتے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا بلکہ حصول اقتدار کا ایک سوچا سمجھا ہوا دیرینہ منصوبہ انسانیت کی راہ میں حائل ہو گیا اور جس نے صحابیت کے تمام فرائض پر پانی پھیر کر صحابہ کو کسی قابل نہ رکھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی سب سے پہلے شخص حضرت عمر تھے جو برہنہ تلوار لیے ہوئے مصلحت کے اسٹیج پر کسی فلمی اداکار کی طرح نمودار ہوئے اور اپنی گرجدار و بے ہنگم آواز میں بولے کہ خبردار اگر رسول کے بارے میں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو خدا کی قسم میں اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالوں گا اور اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس ہنگامہ آرائی اور اداکاری کا مقصد دراصل اپنے منصوبہ کے تحت رسولؐ کی خبر شہادت کو روکنا اور مسلمانوں میں دہشت پھیلانا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسرے حضرت ابوبکر نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر مدینہ سے ملحق ایک گاؤں سُنح میں اپنے خسر خارجہ بن زید انصاری کے یہاں قیام پذیر تھے اور اپنی نئی نویلی دولہن سے داد خواہی میں مصروف تھے جبکہ اصولاً آپ کو دوران علالت اپنے داماد کے پاس موجود رہنا چاہیے تھا۔

چنانچہ اپنی اداکاری کے دوران حضرت عمر نے سالم بن عبید کو آپ کے پاس دوڑایا کہ رسول اللہؐ دنیا سے رخصت ہو چکے اب آپ فوراً آئیے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

حضرت ابوبکر گویا منتظر تھے۔ فوراً آئے اور آتے ہی آپ نے حضرت عمر کے کان میں نہ جانے کون سا منتر پھونک دیا کہ آن واحد میں آپ کا سارا بھوت اتر گیا اور اداکاری ہوا ہو گئی۔

اس کے بعد یہ دونوں صاحبان ابوعبیدہ کے ہمراہ رسول اللہؐ کی میت کو

Presented by www.ziaraat.com

بے غسل و کفن چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ روانہ ہوگئے جہاں پیغمبر اسلام کی خلافت و نیابت کا تاج حضرت ابو بکر کو پہنانا مقصود تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ:

"آنحضرت کے انتقال کے فوراً بعد خلافت کی نزاع پیدا ہو گئی اور اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہ صلعم کی تجہیز و تکفین سے فراغت حاصل کر لی جائے۔ کس کے قیاس میں آسکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم انتقال فرمائیں اور جن لوگوں کو ان کے عشق و محبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر چلے جائیں اور اس بندوبست میں مصروف ہوں کہ مسند حکومت اوروں کے قبضہ میں نہ آجائے۔ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں (حضرت ابو بکر اور حضرت عمر) سے سرزد ہو، جو آسمان کے مہر و ماہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر وغیرہ تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کو مشغول میں مصروف رہے گویا ان پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؑ سے بزور شمشیر منوانا چاہا۔" (الفاروق مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۰۸ حصہ اول ص ۶۵-۶۶)۔

شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب اپنی کتاب امہات الامہ میں رقم طراز ہیں:

"جن بھکڑوں، محتاجوں اور فاقہ مست لوگوں نے فاطمہؑ کے باپ کی بدولت عروج پایا اور خاک مذلت سے اوج عزت پر پہنچے، ان کو شایان شان نہ تھا کہ فاطمہ کے باپ کی رعایت اور پرورش کے حقوق کو یکسر بھلا دیتے۔"

ڈاکٹر محمد ابو بکر خاں صاحب ملیح آبادی "اسلام اور بنی امیہ" کے عنوان سے محرم ۱۳۸۵ھ میں شائع شدہ اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں کہ:

"سادہ لوح مسلمان اور چالاک منافقین مرے نہیں تھے بلکہ منافقت کی نقاب چہروں پر ڈالے مسلمانوں میں مل گئے تھے اور اس دن کا انتظار کر رہے تھے کہ پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوں اور وہ سلطنت اسلامی پر قبضہ کر کے خوب گلچھرے اڑائیں۔ منافقین کے نقطۂ نظر سے وفات رسولؐ کا وقت ہی اس کے لیے نہایت مناسب و مسعود تھا کہ وہ بھولے بھالے مسلمانوں کی مدد سے اپنی دیرینہ آرزوئیں بروئے کار لائیں اور ۲۳ سال تک جس بات کو دل کی گہرائیوں اور منافقت کے پردوں میں چھپائے ہوئے تھے اسے ظاہر کر کے رہیں۔ رسولؐ کے انتقال کے بعد ہی جب کہ ابھی حضور اکرمؐ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی، جنازہ کو چھوڑ کر صحابہ کا یہ اقتدار پسند گروہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گیا اور بالآخر حضرت ابو بکر خلیفہ بن گئے۔"

مولانا خواجہ حسن نظامی ماہنامہ "منادی" جلد ۳۴ شمارہ ۱۱ میں الکشن اور سقیفہ کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ڈبونے والی آگ اور جلانے والا پانی ہے، اس میں سر نہیں، دل نہیں، دماغ نہیں۔ اس کی ناک میں سو سوراخ اس کے چہرے پر ہزار ہزار آنکھیں ہیں۔ اس کی غذا جھوٹ ہے، مکر ہے، فریب ہے۔ اس کی شکل بلّی سے زیادہ مسکین، مگر پنجہ شیر سے زیادہ خاردار ہے۔ اگر سقیفہ کے دن وہ گھر سے باہر نہ نکلا تو کیا ڈر ہے وہ الکشن کی حکمتوں سے تہی دست تو نہ تھا۔ وہ کون؟ میرا باپ، میرا دادا اور رسولِ خداؐ کے بعد سب سے بڑا آدمی علی مرتضیٰ علیہ السلام۔"

تاریخ احمدی ص ۱۰۸ میں بحوالہ کنز العمال عروہ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ کے دفن کے وقت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر موجود نہ تھے بلکہ سقیفہ میں تھے۔ قبل اس کے

Presented by www.ziaraat.com

کہ یہ دونوں صاحبان وہاں سے واپس آئیں، رسول اللہؐ دفن ہو چکے تھے۔

تاریخ ابن خلدون میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میرے باپ ابو بکر اور عمر بن خطاب رسول اللہؐ کی میت کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے۔ لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ، عباس اور عباس کے دونوں پسران، فضل اور قثم اور اسامہ بن زید رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول رہے۔ علیؑ نے آنحضرت کو غسل دیا۔ عباس اور ان کے دونوں پسران آنحضرتؐ کے جسم اطہر کو پلٹتے جاتے تھے اور اسامہ پانی ڈال رہے تھے۔ (تاریخ ابن خلدون ص ۶۳ مطبوعہ ۱۲۸۴ھ)

الغرض جب حضرت ابو بکر خلیفہ بن کر اور حضرت عمر خلیفہ بنا کر سقیفہ بنی ساعدہ سے واپس ہوئے تو دین و دنیا کے تاجدار سپرد خاک ہو چکے تھے۔

اقتدار کی خاطر شیخین نے وہ حالات پیدا کر دیے تھے کہ سرور کائنات اور دین و دنیا کے تاجدار کی میت میں آل اطہار کے علاوہ صرف پانچ آدمی شریک ہو سکے جبکہ مسلمانوں کے مجمع سے مدینہ کی گلیوں کو چھلک جانا چاہیے تھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت

سقیفہ بنی ساعدہ مدینہ منورہ سے تین میل کی دوری پر ایک چھتے کا نام ہے، جہاں چور، بدمعاش اور لٹیرے جمع ہو کر لوٹ مار کا منصوبہ تیار کرتے تھے اور لوٹے ہوئے مال کا بٹوارہ کیا کرتے تھے۔ اجماع کے بعد اس مقام کی تاریخی حیثیت اس لیے اور مستحکم ہو گئی کہ یہاں حضرت علیؑ کے حقوق خلافت پر ڈاکہ ڈال کر لٹیروں نے اسے لوٹ لیا۔

سقیفہ کی کارروائی

سقیفہ کی کارروائی اسلام میں تخریب کاری کی وہ منزل ہے جہاں تمام

ASSOCIATION ... SHIA ITHNA ASHERI JAMATE MAYOTTE

ارشادات پیغمبری، احکام الٰہی اور اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے، جھوٹ، فریب اور مکر کی بنیاد پر ایک غیر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسی غیر اصولی کارروائی کے ذریعہ حضرت ابو بکر ملت مسلمہ کے خود ساختہ خلیفہ بن بیٹھے۔

شیخ محمد مہدی علیہ الرحمہ کی کتاب "جہاد حسین" کے مترجم شیخ محسن علی نجفی تحریر فرماتے ہیں:

"اگر ہم سقیفہ میں اپنائی گئی گفتگو میں منطق کا جائزہ لیں تو قبائلی تعصبات نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں چنانچہ ابو بکر کے قلم سے "اوس" اور "خزرج" کے درمیان عداوت کا احیا ہو گیا۔ انھوں نے دونوں قبیلوں کے مقتولین کا ذکر کیا اور ان زخموں کا ذکر کیا جو ابھی تک مندمل نہ ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے حباب ابن منذر نے بھی اسی جاہلانہ جذبہ سے بات کی اور انصار کو مشتعل کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

مہاجرین کی سوچ بھی اس سے مختلف نہ تھی، ان کا کہنا تھا کہ محمد صلعم کے اقتدار میں ہمارا مدمقابل کون ہو سکتا ہے جبکہ ہم ان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالات اسی ڈگر پر چل نکلے جس کے خطوط حضرت ابو بکر نے قائم کیے تھے۔ چنانچہ انصار قبائلی تعصب سے متاثر ہو کر بٹ گئے اور خلافت کے لیے ان کے امیدوار سعد ابن عبادہ خزرجی اس وقت گوشہ نشین ہو گئے جب قبیلۂ "اوس" نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔"

پیغمبرؐ کی تجہیز و تکفین کے بعد جب امیر المومنینؑ نے سقیفہ کی کارروائی کا حال سنا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ انصار کیا کہتے تھے؟ تو لوگوں نے کہا کہ وہ کہتے تھے کہ ایک ہم میں سے امیر ہو اور ایک تم میں سے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے

Presented by www.ziaraat.com

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

یہ دلیل کیوں نہ پیش کی رسول اللہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ انصار میں جو اچھا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور جو برا ہو اسے درگذر کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اس میں ان کے لیے خلافت کا کیا ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر حکومت و امارت ان کے لیے ہوتی تو ان کے مقابلہ میں دوسروں کو وصیت کیوں کی جاتی پھر حضرت نے پوچھا کہ قریش نے کیا کہا۔ لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شجرہ رسولؐ سے ایک ہونے کی بنا پر اپنے استحقاق پر استدلال کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے پر تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا۔

(جہاد حسین ص ۱۱۱-۱۱۳ بحوالہ نہج البلاغہ ص ۲۰۹-۲۱۰)

امیر المومنین علیہ السلام کی اس حکیمانہ گفتگو کی تشریح میں مفسر نہج البلاغہ علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ فرماتے ہیں:۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصار کے مقابلہ میں مہاجرین کی سب سے بڑی دلیل اور وجہ کامرانی یہی چیز تھی کہ قریش چونکہ پیغمبرؐ کے ہم قوم و ہم قبیلہ ہیں لہٰذا ان کے ہوتے ہوئے کوئی غیر خلافت کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر انصار کا جم غفیر صرف تین مہاجرین کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور وہ نسلی امتیاز کی بنا پر بازی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ مورخ طبری واقعات سقیفہ کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد ابن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کا اجماع کیا تو حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور ابو عبیدہ بن جراح بھی سن گن پا کر وہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر نے پہلے ہی سے کچھ سوچ لیا تھا جسے کہنے کے لیے وہ کھڑے ہوئے مگر ابو بکر نے انھیں روک دیا اور خود کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ:

یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے زمین پر اللہ کی پرستش کی اور

ایمان لائے۔ یہی پیغمبرؐ کے دوست اور ان کے کنبہ والے ہیں اور یہی سب سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ جو ان سے ٹکرائے گا وہ ظالم ہوگا۔

(طبری ج ۲ ص ۴۵۷)

جب ابو بکر اپنا بیان ختم کر چکے تو حباب ابن منذر کھڑے ہوئے اور انھوں نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے گروہ انصار! تم اپنی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں نہ دو، دنیا تمھارے سائے میں بس رہی ہے۔ تم عزت و ثروت والے اور قبیلے و جتھے والے ہو۔ اگر مہاجرین کو تم پر بعض چیزوں میں فضیلت حاصل ہے تو تمھیں بھی بعض چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ تم نے انھیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔ تم ہی اسلام کے بازوئے شمشیر زن ہو۔ تمھاری ہی وجہ سے اسلام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ہے۔ تمھارے شہروں میں آزادی سے نمازیں قائم ہوئیں۔ تم تفرقہ اور انتشار سے اپنے کو بچاؤ اور اپنے حق پر جمتے سے جمے رہو۔ اگر مہاجرین تمھارا حق تسلیم نہ کریں تو پھر ان سے کہو کہ ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے ہوگا۔

حباب یہ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دو حکمراں ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس بات پر کبھی راضی نہ ہوں گے کہ تمھیں اپنا امیر بنائیں جب کہ نبیؐ تم میں سے نہیں تھے، البتہ عربوں کو اس امر میں پس و پیش نہ ہوگا کہ وہ خلافت کو اس کے حوالے کر دیں کہ جس کے گھرانے میں نبوت ہو اور صاحب امر بھی انھیں میں سے ہو اور انکار کرنے والے کے سامنے اس سے ہمارے حق میں کھلم کھلا دلیل اور واضح برہان لائی جا سکتی ہے۔ جو ہم سے محمدؐ کی سلطنت و امارت میں ٹکرائے گا وہ باطل کی طرف جھکنے والا ہوگا۔ (طبری ج ۲ ص ۴۵۷)

Presented by www.ziaraat.com

ASSOCIATION ... SHIA ITHNA ASHERI JAMATE

حضرت عمر کے اس بیان کے بعد حباب پھر کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ دیکھو اپنی بات پہ ڈٹے رہو اور اس کی اور اس کے ساتھی کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ شخص تمہارے حقوق کو دبانا چاہتا ہے۔ اگر مہاجرین نہیں مانتے تو انھیں اپنے شہروں سے نکال دو اور خلافت کو سنبھال لو۔ بھلا تم سے زیادہ اس کا حق دار کون ہو سکتا ہے۔

جب حباب خاموش ہوئے تو حضرت عمر نے انھیں سخت وسست کہا اُدھر سے بھی تلخ کلامی ہوئی اور رنگ بگڑنے لگا۔ ابو عبیدہ نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ نازک ہے تو انصار کو ٹھنڈا کرنے اور اپنے ڈھرے پر لانے کے لیے بولے۔ اے گروہ انصار! تم وہی ہو جنھوں نے ہمیں سہارا دیا، ہماری امداد کی، اور اب اپنی روش کو نہ بدلو اور اپنے طور وطریقوں کو نہ چھوڑو۔ مگر انصار ان کی خوشامد میں نہیں آئے کیونکہ وہ سعد کے علاوہ اور کسی کی بیعت پر تیار نہ تھے اور وہ بیعت کے لیے بڑھا ہی چاہتے تھے کہ سعد ہی کے قبیلے کا ایک شخص بشیر خزرجی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

بے شک ہم نے جہاد میں قدم بڑھایا اور دین کو سہارا دیا مگر اس سے ہماری غرض صرف اللہ کی رضامندی اور اس کے رسول کی اطاعت تھی ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم تفوق جتلائیں اور خلافت کے معاملہ میں جھگڑا کریں چونکہ محمدؐ قریش سے تھے لہٰذا ان کی وراثت اور نیابت کا حق بھی انھیں کی قوم کو پہنچتا ہے۔

بشیر کا یہ کہنا تھا کہ انصار میں پھوٹ پڑ گئی اور بشیر کا مقصد بھی یہی تھا، کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے کسی شخص کو اس طرح بڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔

مہاجرین نے اس افتراق سے پورا فائدہ اٹھایا اور حضرت عمر اور ابو عبیدہ

نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کا مکمل تہیہ کر لیا۔ ابھی وہ ان کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ بشیر نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ ابوبکر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے بیعت کی اور سعد ابن عبادہ کو پیروں تلے کچل کر رکھ دیا۔

امیر المومنین علیہ السلام اس موقع پر پیغمبرؐ کے غسل وکفن میں مصروف تھے۔ بعد میں جب سقیفہ کی کارگزاری سنی تو یہ لطیف جملہ ارشاد فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے کی دلیل تو لائے ہیں لیکن اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا جو پیغمبرؐ کے اہل بیت ہیں۔

خلیفہ کی ضرورت اور تقرری

خلاق کائنات نے جب خلیفہ کی ضرورت کو محسوس کیا تو ملائکہ سے فرمایا کہ میں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بھیجنے والا ہوں۔ چنانچہ اسی ارادۂ قدرت کے تحت حضرت آدم کی تخلیق عمل میں آئی، اور پھر آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر نبی اپنے بعد اپنا نائب وجانشین مقرر کرتا رہا۔ غرض کہ حضرت آدم نے اپنے بیٹے شیثؑ کو اپنا ولی عہد اور جانشیں بنایا۔ حضرت شیث نے انوش کو اور انوش نے اپنے فرزند قینان کو اپنا وصی بنایا۔ قینان نے مہائیل کو جانشین مقرر کیا، مہائیل نے یزدیار کو اور یزدیار نے اپنے فرزند خنوخ (حضرت ادریس) کو اپنی جانشینی کا شرف بخشا۔ حضرت ادریس کے بعد اُن کے بیٹے متوشلخ ان کے جانشین ہوئے اور متوشلخ نے لمک کو اپنا خلیفہ بنایا۔ پھر حضرت نوحؑ نے اپنے فرزند سام کو اپنا جانشیں مقرر کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰق کو شام میں اپنا نائب اور وزیر مقرر فرمایا اور جب حضرت اسمٰعیل کا زمانۂ وفات

Presented by www.ziaraat.com

قریب آیا تو انھوں نے بھی اپنے بھائی اسحاق ؑ ہی کو اپنی ذمہ داری سونپی۔ حضرت اسماعیل ؑ نے ایک دوسرے مقام پر قیدار کو بھی اپنا وصی بنایا تھا۔ حضرت اسحاق ؑ نے اپنے فرزند یعقوب ؑ کو اپنا ولی عہد مقرر فرمایا۔ حضرت موسیٰ ؑ نے ہارون ؑ کو اپنا ولی بنایا تھا لیکن ہارون ؑ کا انتقال چونکہ حضرت موسیٰ ؑ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اس لیے ہارون کے بعد یوشع بن نون حضرت موسیٰ کے وصی مقرر ہوئے۔ یوشع بن نون نے کالب کو اور کالب نے اپنے فرزند یوساقوس کو اپنا وصی مقرر کیا۔ جناب داؤد ؑ نے اپنے فرزند سلیمان ؑ کو اپنا وصی مقرر کیا اور حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنا وصی شمعون کو مقرر کیا۔ (روضۃ الصفا ج ۱ ص ۱۸۴، تاریخ طبری ج ۱ ص ۷۶، ۸۲، ۸۳، ۱۷۲، ۱۶۷، ۲۸۵، تاریخ کامل ج ۱ ص ۲۶، ۷۴، ۷۸، ۸۲ وغیرہ)

انبیاء و مرسلین میں نیابت، وصایت، ولایت اور خلافت کا یہ سلسلہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خدا نے ہر نبی کو اپنے بعد اپنی امت کے لیے جانشین اور قائم مقام مقرر کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ جو تاجدار انبیاء اور فخر مرسلین ہو وہ اپنی امت کو مفسدین اور منافقین کے رحم و کرم پر لاوارث چھوڑ جائے۔ لیکن "المرتضیٰ" کے فاضل مولف مولانا ندوی کا اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ کہنا تعجب خیز ہے کہ "اسلام نے خلیفہ کے منتخب کرنے کی ذمہ داری، مسلمانوں اور اہل شوریٰ اور اہل علم و اخلاص کے سپرد کر دی۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہو گا۔ اگر ایسا کرنا دینی فرائض میں داخل ہوتا اور اس کو صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپ اس حکم کی تنفید ضرور فرماتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

"اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔" (سورۃ المائدہ۔ ۶۷)

(المرتضیٰ ص ۱۲۱۔ ۱۲۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا ندوی کے اس بیان پر "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی کہاوت مکمل طور پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ مولانا نے اپنی غلط اور مہمل بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی جس آیت کا سہارا لیا ہے اس کا نزول پیغمبر اسلام ؐ پر آخری حج کی واپسی کے دوران ہوا اور پیغمبر نے اس حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو کر میدانِ غدیر میں پالان شتر کے منبر سے علی ؑ کی ولایت اور جانشینی کا اعلان کر کے اللہ کے اس پیغام کو مسلمانوں تک پہنچا دیا جس کے لیے حکم تھا۔ مکمل وضاحت باب ثانی میں بخ بخ کے۔ عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں تک پیغمبر ؐ کا اپنے بعد اپنا جانشین مقرر یا نہ مقرر کرنے کا سوال ہے اس موضوع پر مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ نے بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"پیغمبر اسلام ؐ کے بعد ایک ایسی ہستی کا وجود ناگزیر تھا جو امت کا شیرازہ نہ بکھرنے دے اور شریعت ان لوگوں کے دست برد سے بچائے رکھے جو اسے توڑ مروڑ کر اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال لینا چاہتے ہوں۔ اگر اس کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو پھر پیغمبر ؐ کے بعد ان کی نیابت و جانشینی کے مسئلے کو اتنی اہمیت دینے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ان کی تجہیز و تکفین پر سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کو مقدم سمجھ لیا جائے اور اگر اس کی ضرورت ثابت ہے تو کیا پیغمبر ؐ کو بھی اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے کہ انھیں اس کی ضرورت یا عدم ضرورت کا احساس

Presented by www.ziaraat.com

ہوتا تو پیغمبرؐ کے ذہن کو ارتداد کی فتنہ انگیزیوں اور بدعتوں کی کارفرمائیوں کی خبر دینے کے باوجود ان کی روک تھام اور فکر کی تدبیر سے خالی سمجھ لینا عقل اور بصیرت سے محرومی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ احساس تو تھا مگر مصلحت کی بنا پر اسے غیر طے شدہ چھوڑ جانے پر مجبور تھے تو اس صورت میں اس مصلحت کو زیر نقاب رہنے کے بجائے کھل کر سامنے آنا چاہیے ورنہ بے وجہ خاموشی فرائض نبوت میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔ اور اگر کوئی مانع تھا تو اس مانع کو پیش کرنا چاہیے، ورنہ اسے تسلیم کیجیے کہ جس طرح آپ نے ذہن کا کوئی گوشہ ادھورا نہیں چھوڑا اسی طرح اسے بھی ناتمام نہیں رہنے دیا اور ایک ایسا لائحہ عمل تجویز فرمایا کہ جس کے بروئے کار لانے سے دین دوسروں کے دست برد اور استیلا سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ طریقۂ کار کیا تھا؟ اگر اجماع امت کو پیش کیا جائے تو اس کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اجماع میں ایک ایک فرد کا اتفاق رائے ضروری ہے اور اگر انسانی طبائع کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک نقطہ پر متحد ہو جائیں اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ جہاں ایسے موارد پر اختلاف کی کوئی آواز نہ اٹھی ہو، تو پھر کیونکر ایک ایسی بنیادی ضرورت کو ایک ناممکن الوقوع امر سے وابستہ کیا جا سکتا ہے کہ جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہو اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا دار و مدار ہو۔ لہٰذا نہ عقل اس معیار کو تسلیم کرنے کو تیار ہے نہ نقل ہی اس سے ہمنوا ہے۔ چنانچہ قاضی عضد الدین نے مواقف میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"تمہیں جاننا چاہیے کہ خلافت کا انعقاد اجماع پر منحصر ہے، کیونکہ اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل قائم نہیں ہو سکی۔"

مدعیان نے جب یہ دیکھا کہ راویوں کا متفق ہونا مشکل ہے تو اقلیت کے اختلاف کو نظر انداز کر کے اکثریت کے اتفاق کو اجماع کے قائم مقام ٹھہرایا۔ لیکن اس صورت میں بھی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ حق و ناحق اور جائز و ناجائز وسائل کا زور اکثریت کا رخ ادھر موڑ دیتا ہے جہاں نہ شخصی فضیلت ہوتی ہے نہ ذاتی قابلیت جس کے نتیجہ میں اہل افراد دبکے پڑے رہ جاتے ہیں اور نا اہل ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ تو جہاں صلاحیتیں پھڑپھڑا کر رہ جائیں اور ذاتی غرضیں روک بن کر کھڑی ہو جائیں وہاں کسی صحیح شخص کے انتخاب کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمام رائے دہندگان ایسے افراد ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی رائے آزاد اور بے لاگ ہے، نہ ان میں کوئی صاحب غرض ہے نہ کسی کی رو رعایت رکھتا ہے تو بھی کہاں یہ ضروری ہے کہ اکثریت کا ہر فیصلہ صحیح ہو اور وہ بھٹک کر غلط راستے پر آ ہی نہ سکے جبکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اکثریت نے تجربہ کے بعد خود اپنے فیصلوں کو غلط بھی ٹھہرایا ہے۔

ان حالات میں اگر خلیفہ و جانشین کا انتخاب غلط ہو تو اس غلطی کے مہلک نتائج کا ذمہ دار کون ہو گا اور اسلام کی ہیئت اجتماعی کی تباہی و بربادی کا مظلمہ کس کی گردن پر جائے گا اور پھر انتخاب کی ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں پر جو خوں ریزی اور فساد برپا ہو گا وہ کس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا جبکہ بزم ادب آموز میں بھی بیٹھنے والوں کو دیکھا جا چکا ہے کہ وہ باہم آویزیوں سے نہ بچ سکے تو کسی اور کا دامن کیا بچ سکتا ہے۔

اگر ان مفاسد سے بچنے کے لیے اسے اہل حل و عقد پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی صواب دید سے کسی ایک کو منتخب کر لیں تو یہاں بھی وہی انتشار و کشمکش کی صورت پیش آئے گی کیونکہ انسانی طبائع کا یہاں بھی ہم آہنگ ہونا ضروری

Presented by www.ziaraat.com

نہیں ہے اور نہ انھیں ذاتی اغراض کی سطح سے بلند قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ یہاں تصادم اور ٹکراؤ کے اسباب اور زیادہ قوی ہیں کیونکہ اکثر سب نہیں تو اکثر خود اس منصب کے لیے امیدوار ہوں گے اور اپنی کامیابی کے لیے اپنے حریف کو زک پہنچانے میں کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں گے اور جس طرح بن پڑے گا اس کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باہم آویزی اور فتنہ انگیزی پیدا ہوگی اور جس اختلاف سے بچنے کے لیے یہ صورت پیدا کی گئی ہے اس سے بچاؤ نہ ہو سکے گا اور امت کسی صحیح فرد تک پہنچنے کے بجائے دوسروں کے ذاتی مفاد کا آلۂ کار بن کر رہ جائے گی۔ پھر یہ اہل حل و عقد کا معیار کیا ہوگا؟ وہی جو ہر زمانے میں رہا ہے کہ جس نے چند ہوا خواہ جمع کر لیے اور کسی اجتماع میں چند مخصوص و پرجوش لفظیں دہرا کر ہُلّڑ مچوا دیا وہ ابھر کر اہل حل و عقد کی صف میں آگیا۔ یا صلاحیتوں کو بھی پرکھا جائے گا۔ اگر صلاحیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کا طریقہ یہی رائے عامہ ہے تو پھر وہی کش مکش اور الجھنیں یہاں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ جس کے لیے یہ راہ نکالی گئی ہے اور اگر کوئی معیار ہے تو اس پر ان کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے بجائے اس کی صلاحیت کو کیوں نہ پرکھ لیا جائے جسے اس منصب کا اہل سمجھا جا رہا ہے۔ یہ ہے سقیفہ بنی ساعدہ کی کارروائی اور شوریٰ کی گرم بازاری کہ ایک ہی شخص کے کارناموں کا نام اجماع اور ایک ہی فرد کی کارفرمائی کا نام شوریٰ رکھ دیا گیا۔

حضرت ابو بکر نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اجماع ایک ہی آدھ کی رائے کا نام ہوا کرتا ہے جسے بھولے بھالے عوام کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اجماع اور شوریٰ کا رنگ چڑھائے بغیر علانیہ حضرت عمر کو نامزد کر کے اجماع کی پابندی، کثرت رائے کے معیار اور شوریٰ کے طریقۂ

انتخاب کو نظر انداز کر دیا۔

حضرت عائشہ کے نزدیک بھی خلافت کو امت یا چند مخصوص افراد کی رائے پر چھوڑنا فتنہ و فساد کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر کو بستر مرگ پر پیغام بھجوایا کہ امت محمدیہ کو بغیر کسی پاسبان کے نہ چھوڑ لے اور اسے بے مہار رہنے نہ دیجیے کیونکہ اس صورت میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔

جب اہل حل و عقد کا طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا تو اسے بھی ختم کر دیا گیا اور یہ کہ "ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند" معیار بن کر رہ گیا۔ یعنی جو دوسروں کو اپنے اقتدار اور تسلط کے بندھن میں جکڑ لے وہی خلیفۂ برحق و جانشینِ رسولؐ ہے۔

یہ تھے وہ خود ساختہ اصول جن کے سامنے پیغمبرؐ کے تمام ارشادات جو انھوں نے دعوت ذوالعشیرہ، شب ہجرت، غزوۂ تبوک، تبلیغ سورہ برأت اور غدیر خم کے موقع پر فرمائے تھے، یکسر فراموش کر دیے گئے۔

حیرت ہے کہ جب تینوں خلافتیں ایک ہی فرد کی رائے سے طے پاتی ہیں تو پھر کس دلیل کی بنا پر پیغمبرؐ سے یہ حق سلب کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا تعین خود فرما دیتے اور تمام خلفشار سے امت کو محفوظ کر جاتے۔ چنانچہ پیغمبرؐ نے وقت آخر فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تاکہ یہ نوشتہ چھوڑ دوں کہ میرے بعد کون خلافت کا حق دار ہوگا لیکن آنحضرتؐ کی اس خواہش نوشتہ کو حضرت عمر نے ٹھکرا دیا اور سقیفہ میں دوسرے تمام مسلمانوں سے ہٹ کر خلافت پر اجماع کیا اور پیغمبرؐ کی اس وصیت کو جو علی کے بارے میں تھی بھول گئے ....!!

دھما چوکڑی

سقیفائی خلیفہ کی حیثیت سے جب حضرت ابو بکر تخت خلافت پر

Presented by www.ziaraat.com

غاصبانہ قابض ہوئے اور اقتدار ہاتھ آیا تو آپ نے اپنے مافیا گروہ کے ذریعہ مدینہ کو مرکز آلام بنا دیا اور ان لوگوں پر مظالم، تشدد اور غنڈہ گردی کا بازار گرم ہونے لگا جو آپ کی خلافت سے متفق نہیں تھے یا جن لوگوں نے آپ کی بیعت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس فہرست میں بنی ہاشم کے علاوہ سلمانؓ فارسی، ابوذرؓ غفاری، عمارؓ یاسر، مقدادؓ، خالد بن سعید، زبیر، عقبہ بن ابولہب، براء بن عازب، ابی ابن کعب، مالک بن نویرہ اور ابو سفیان وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افراد نے ابو بکر کی ناجائز خلافت پر کھل کر احتجاج بھی کیا اور ان کے احتجاج کی آواز بازگشت صرف مدینہ کی گلیوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے اثرات بیرون مدینہ یمامہ، منامہ، عمان، یمن، بحرین اور حضر موت وغیرہ پر بھی مرتب ہوئے اور شورش و بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کا جو راستہ اختیار کیا گیا وہ مظالم اور تشدد کا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت ابو بکر نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ خالد بن ولید ایسے ظالم و جابر شخص کو پندرہ ہزار کے لشکر کی سرداری دے کر یمامہ اور حضر موت وغیرہ کے مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ الغرض ایک طرف خالد بن ولید مدینہ سے باہر یمامہ اور حضر موت کے مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے تھے اور دوسری طرف اندرون مدینہ ابو بکر کی حمایت میں حضرت عمر اپنی جماعت کو لیے بربریت کا ننگا ناچ ناچ رہے تھے۔ جس کے سبب سے آل رسولؐ پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اہل بیت اطہارؑ سے حضرت عمر کی دشمنی اور عداوت اس فعل سے ظاہر ہے کہ آپ امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام سے ابو بکر کے لیے بیعت طلبی کی گستاخی اور جسارت کر بیٹھے اور صرف یہی نہیں بلکہ چند غنڈوں کے ہمراہ آگ اور لکڑیاں لے کر رسولؐ کی غمزدہ اور سوگوار

بیٹی فاطمہ زہراؑ کی چوکھٹ پر پہنچ گئے اور یہ مطالبہ کیا کہ علیؑ کو گھر سے باہر نکالو ورنہ ہم اس گھر میں آگ لگا دیں گے اور سب کو زندہ جلا کر خاک کر دیں گے۔

بنت رسولؐ جب اس ہنگامے سے باخبر ہوئیں تو آپ دروازے کے قریب تشریف لائیں اور حضرت عمر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دو گے۔ عمر نے کہا کہ خدا کی قسم اگر حضرت علیؑ ابو بکر کی بیعت نہ کریں گے تو ہم اس گھر کو پھونک دیں گے۔ جناب فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ اس گھر میں ابوالحسنؑ کے علاوہ رسول اللہؐ کے دونوں نواسے حسنؑ اور حسینؑ بھی ہیں۔ عمر نے کہا، ہوا کریں ...، حضرت عمر کے اس جواب پر معصومہؑ کو نین بے اختیار رونے لگیں اور آپ نے فرمایا کہ اے پدر بزرگوار! آپ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہم پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور آپ کی امت کے لوگ ہم سے کس طرح پھر گئے ہیں۔ لیکن حضرت عمر پر معصومہؑ کی اس آہ و زاری اور فریاد و فغاں کا مطلق اثر نہ ہوا، اور آپ نے وہی کیا جو آپ کا مقصد تھا۔ فاطمہؑ کے گھر میں آگ لگا دی گئی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ لیکن اس پر بھی حضرت عمر کے دل کو تسلی نہ ہوئی اور آپ کی آتش غضب ایسی بھڑکی کہ آپ نے جلتے ہوئے دروازے کو لات مار کر معصومہؑ پر گرا دیا جس کی ضرب سے آپ کا پہلوئے مبارک شکستہ ہو گیا اور آپ کے شکم میں جناب محسنؑ شہید ہو گئے۔ اس بے مثال کارنامے کے بعد حضرت عمر دندنا اپنے غنڈوں کے ہمراہ خانۂ زہراؑ میں داخل ہوئے اور آپ نے دھما چوکڑی مچا دی۔ سارے گھر کو تہس نہس کر ڈالا اور امیر المومنین حضرت علیؑ ابن طالبؑ جیسے شجاع و بہادر کے گلے میں اپنی بزدلی کی رسی باندھ کر گھر سے باہر لائے اور اسی حالت میں مولائے

Presented by www.ziaraat.com

کائنات کو لیے ہوئے دربار ابوبکری میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بیعت کرو ورنہ خدا کی قسم سر کاٹ لوں گا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تم لوگ کس حق کی بنیاد پر مجھ سے بیعت کے طالب ہو۔ خدا کی قسم مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا۔ تمھیں چاہیے کہ میری بیعت کرو کیونکہ رسول کا وارث اور جانشین میں ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دنیا سے رخصت بھی ہو گئے لیکن حضرت علی نے کبھی ان کی بیعت نہیں کی۔ (الامامت والسیاست ج ۱ ص ۱۳)

تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۱۶ میں ہے کہ جب حضرت علیؑ کو عمر گرفتار کرکے دربار خلافت کی طرف لے چلے تو حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ ابوالحسن کو چھوڑ دو، ورنہ بددعا کے لیے میں اپنے سر کے بال کھول دوں گی۔

طبری کا کہنا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے اس کہنے پر مسجد نبوی کی دیوار قد آدم بلند ہوگئی تھی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شیخین سے وقت آخر تک کلام نہیں کیا اور ناراض و غضبناک اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

خالد بن ولید کے مظالم

حضرت ابوبکر نے خالد بن ولید کو حصول بیعت کے لیے اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ جب تم یمامہ اور حضرموت کے مسلمانوں پر غالب آنا اور انھیں قتل کرنا تو ان کی لاشوں کو جلا کر خاک کر دینا۔ قیدیوں اور زخمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا اور قتل عام میں کوئی کوتاہی نہ کرنا اور لوگوں کو عبرتناک سزائیں دینا۔

(تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۰۶)

چنانچہ خالد نے ابوبکر کے اس حکم کے تحت دس ہزار مسلمانوں کو قتل کیا اور تمام مقتولین کی لاشوں کو ایک گڑھے میں جمع کرکے نذر آتش کر دیا (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۳۵)

مقتولین میں ستر حافظ قرآن بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صدقات کے حامل تھے۔ حامیہ بن سبیع کو زندہ آگ میں جلا کر مار ڈالا گیا۔ مالک بن نویرہ کو خالد بن ولید نے قتل کرکے اس کا چولھا بنایا اور اس میں کھانا پکوا کر کھایا۔ جب اس پر انسانی خون کی آمیزش کا نشہ سوار ہوا تو اس نے اسی رات کو مالک کی سوگوار اور غمگسار بیوہ سے اپنا منھ کالا کیا۔ (تاریخ الاعیان ص ۲۷۹)

مالک بن نویرہ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مالک کے سامنے حضرت ابوبکر نے اپنی بیعت کا سوال پیش کیا تو انھوں نے نہایت سختی اور حقارت سے جھڑک دیا اور کہا کہ آپ اپنی حیثیت پر قائم رہیے اور اپنے گھر بیٹھیے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کیجیے۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اس تخت خلافت پر قابض ہوئے ہیں جس کے لیے اللہ اور رسول نے کسی اور کو نامزد کرکے حاکم بنایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں حضرت علیؑ کی ولایت اور خلافت کا اعلان کرکے کسی حجت اور دلیل کو باقی نہیں رکھا۔ (تحفۃ العباد ص ۴۰۵)

تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۳۱ میں ہے کہ جب خالد کے ہمراہی اس کی بربریت کو دیکھ کر چیخ اٹھے تو اس نے اپنے ساتھیوں کو ابوبکر کا تحریری حکم نامہ دکھایا۔

فدک پر قبضہ

انتہائی سخت گیر مظالم اور کرب و اضطراب کے عالم میں معصومۂ کونین حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کو یہ اطلاع ملی کہ ابوبکر نے ایک فرضی حدیث کو رسول اللہ سے منسوب کرکے آپ کی جائداد فدک پر قبضہ کرکے آپ کو ترک کر

Presented by www.ziaraat.com

پدری سے محروم کر دیا ہے اس اندوہ ناک خبر سے آپ بے حد رنجیدہ اور ملول ہوئیں، کیونکہ یہ جائداد آپ کو اپنے شفیق باپ سے ہبہ کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی اور آپ رسالت مآب صلعم کی زندگی ہی سے اس پر قابض اور متصرف تھیں۔

حضرت ابوبکر کے اس غاصبانہ طرز عمل کے خلاف حضرت فاطمہ زہرا نے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب اور حسنین کے ہمراہ ام ایمن کو بھی بطور گواہان پیش کیا۔ لیکن وہاں انصاف کا کیا سوال؟ اس لیے کہ عدالت کی کرسی پر جو شخص منصف کی حیثیت سے بیٹھا تھا وہی مجرم بھی تھا چنانچہ آپ کے گواہان کو مسترد کرتے ہوئے آپ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ (صواعق محرقہ ص ۲۳۔ الفاروق ج ۲ ص ۲۲۸)

فدک پر غاصبانہ قبضہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے مولانا شاہد زعیم فاطمی اپنے ایک طویل مقالہ مطبوعہ سرفراز ۲ راگست ۱۹۷۷ء میں "علی ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف" کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ:

"ایک فرضی اور سراسر جعلی حدیث کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یکلوتی صاحبزادی سیدہ فاطمہ زہرا کو حضور کے ورثہ سے جس طرح محروم کیا گیا وہ بذات خود ایک المیہ ہے۔ سیدہ فاطمہ اپنا جائز حق مانگ رہی تھیں اور انھیں ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے پیغمبر کا ایک قول گڑھ لیا گیا۔ وضع حدیث کا صریحاً یہ پہلا ارتکاب تھا جو اسلام کے خلیفۂ اول نے کیا اور انھوں نے اہل بیت نبوت کو ورثۂ نبوت سے محروم رکھنے کے لیے ایک ایسی حدیث وضع کی جو بیسیوں آیات قرآنی اور نصوص قطعیہ کے سراسر خلاف تھی، جس شخص نے بھی اس ظلم اور صریح زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی

اسے ختم کرنے اور بزور شمشیر چپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ قرآن مقدس اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے نہ کسی ابوبکر کا محتاج ہے، نہ کسی عمر کا، قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جس کی رو سے وراثت کے حق کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوالقربیٰ اور اہل بیت نبوت کے لیے منسوخ کیا گیا ہے۔"

مشہور سنی عالم ڈپٹی نذیر احمد خاں نے اپنی کتاب رویائے صادقہ میں فرمایا ہے کہ:

"جو شخص رسول کی وفات سے سب سے زیادہ متاذی ہوا وہ فاطمہ تھیں۔ آپ کی والدہ پہلے ہی انتقال فرما چکی تھیں اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب ہی تھے اور باپ بھی کیسے؟ دین و دنیا کے بادشاہ، ایسے باپ کا سایہ سر سے اٹھنا، اس پر علی کا خلافت سے محروم ہونا، ترکۂ پدری فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا، انھیں رنجوں میں گھٹ گھٹ کر انتقال فرما گئیں۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"سخت افسوس ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ایسے ناملائم حالات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا اور اس میں ضعف آ گیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے سرزد ہوئی کہ سچ پوچھو تو منھ دکھانے کے قابل نہ رہے۔" (رویائے صادقہ ص ۱۵۲)

بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر نے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر سیدہ فاطمہ زہرا کو دے دیا تھا اور وہ اسے لے کر جانا ہی چاہتی تھیں کہ اتنے میں حضرت عمر آ گئے اور انھوں نے معصومہ سے پوچھا کہ یہ کاغذ کیسا ہے،

Presented by www.ziaraat.com

فرمایا کہ فدک کے واگزاشت کی سند ہے جو ابوبکر نے مجھے دی ہے۔ یہ سن کر آپ غصہ سے پاگل ہو اٹھے اور اسے فاطمہ زہرا کے ہاتھ سے چھین کر پارہ پارہ کر دیا ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسے پیروں سے مسل ڈالا اور اس پر تھوکا۔

(سیرت حلبیہ ص ۱۸۵)

فدک کی حقیقت

فدک مدینہ منورہ سے تقریباً پچاسی میل کی دوری پر خیبر کے نواح میں ایک سرسبز و شاداب مقام کا نام تھا۔ جس کا طویل رقبہ زرخیز زمینوں اور باغات پر مشتمل تھا، یہ علاقہ یہودیوں کی ملکیت تھا جو ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا۔ سبب یہ تھا کہ یہودیوں کو جنگ خیبر کے بعد پیغمبر اسلام کی طاقت اور قوت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا اور وہ لوگ اپنے مستقبل سے خائف تھے چنانچہ یہ دیکھ کر کہ آنحضرتؐ نے خیبر فتح ہونے کے بعد کچھ یہودیوں کو امان اور پناہ دے کر انھیں چھوڑ دیا ہے، ان لوگوں نے بھی مصالحت اور پناہ چاہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صلح کا پیغام بھیج کر یہ خواہش ظاہر کی کہ فدک کا علاقہ ان سے لے کر انھیں امان و پناہ دے دی جائے۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس درخواست اور خواہش کو منظور فرمایا جس کے نتیجہ میں فدک کا علاقہ حاصل ہوا، جو آپ کی تنہا ملکیت قرار پایا کیونکہ دیگر مسلمانوں کا صرف انھیں اموال میں حصہ ہوتا ہے جو جہاد کے موقع پر بطور مال غنیمت حاصل ہوا ہو، اور جو مال بغیر فوج کشی یا بغیر جنگ و جدال کے حاصل ہو وہ مال فَے کہلاتا ہے اور وہ سربراہ کا خصوصی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فدک کا علاقہ بغیر جنگ و جدل اور فوج کشی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل

ہوا تھا اس لیے وہ آپ کی خصوصی ملکیت تھا۔ دیگر مسلمانوں کا نہ اس میں کوئی حق تھا نہ حصہ۔ چنانچہ طبری نے تحریر فرمایا ہے کہ "فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص تھا کیوں کہ مسلمانوں نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ"۔

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۰۲)

تقریباً یہی عبارت بلاذری کی کتاب فتوح البلدان کے ص ۲۷ پر بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فدک کا علاقہ آنحضرتؐ کو بغیر جنگ کے حاصل ہوا تھا اور مورخین کا اجماع و اتفاق اس امر پر بھی ہے کہ جب فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ اور ملکیت میں آیا تو جبرئیل امینؑ اللہ کا حکم لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ اپنے قرابت داروں کو ان کا حق دے دو۔ آپ نے فرمایا میرے قرابت داروں سے مراد کون لوگ ہیں اور ان کا حق اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ جبرئیل نے کہا کہ خدا کا حکم ہے کہ فدک کو فاطمہؑ کو دے دیجیے۔ چنانچہ آپ نے فوراً فاطمہ زہراؑ کو طلب فرمایا اور تحریری ہبہ نامہ کے ذریعہ فدک کی ملکیت مع قبضہ فاطمہ کے حق میں منتقل کر دی۔

درمنثور مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۱۷۶، ۱۷۷ سطر ۱۵ تا ۱۹ درج ہے کہ آنحضرتؐ نے اللہ کے حکم سے فدک فاطمہ زہراؑ کو دے دیا تھا۔ شرح مواقف ص ۵۳۷ پر بھی تقریباً یہی عبارت تحریر ہے۔ مدارج النبوۃ ج ۴ ص ۲۲۱ پر بھی ہے کہ فدک کو رسول اللہؐ نے بذریعہ تحریری ہبہ نامہ فاطمہؑ کے حق میں منتقل کر دیا تھا۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۸ میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ جب آیۂ ذوالقربیٰ نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے فرمایا اے فاطمہؑ فدک تمہارا حصہ ہے۔

لیکن جب حضرت ابوبکر نے تخت خلافت پر قبضہ کیا اور اقتدار کے نشے میں آپ کا شیطانی ایمان ڈگمگایا تو آپ نے تمام اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے فاطمہ زہراؑ کو بے دخل کر دیا اور فدک پر قابض ہو گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ

Presented by www.ziaraat.com

ابوبکر نے فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ سے فدک چھین لیا اور شہزادی نے جب اپنے حق کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں فدک کو مجھے ہبہ کیا تھا تو حضرت ابوبکر نے معصومہؑ کے اس بیان کو ان کی غلط بیانی پر محمول کرتے ہوئے دعویٰ خارج کر دیا۔ امام بلاذری فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ نے ابوبکر سے فرمایا کہ رسول اللہ نے فدک مجھے دیا ہے جس پر ابوبکر نے آپ سے گواہان کا مطالبہ کیا اور آپ نے گواہی میں، حضرت علیؑ، ام ایمن اور حسنینؑ کو پیش کیا۔ لیکن ابوبکر نے ان گواہان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

(فتوح البلدان ص ۳۸)

گواہان کے مطالبہ کے ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی قانون ایسا ہے جس کے تحت بار ثبوت اس شخص کے ذمہ ہو جو بذات خود کسی جائداد پر قابض و دخیل ہو اور قبضہ کے جواز میں تحریری ثبوت بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ابوبکر کس حق اور کس قانون کی بنیاد پر شہزادی سے گواہان اور ثبوت کا مطالبہ کر رہے تھے جبکہ معصومہؑ کا قبضہ بھی تھا اور تحریری ہبہ نامہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ قبضہ خود ایک محکم دلیل رکھتا ہے۔

ابوبکر کس حیثیت سے فدک پر قابض ہو گئے؟ دراصل یہ ذمہ داری تو ابوبکر پر عائد ہوتی تھی کہ وہ اپنے حق تصرف کے جواز میں کوئی ثبوت فراہم کرتے لیکن وہ کوئی معقول دلیل نہ لا سکے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ابوبکر کے ہی دور میں ان کے سامنے اسی نوعیت کے دیگر مقدمات پیش ہوئے اور انھوں نے بغیر کسی گواہی کے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:۔

"جابر ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ میں نے ابوبکر کی عدالت میں اس امر کا دعویٰ کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمھیں اتنا اور اتنا دوں گا مگر پیغمبرؐ کی وفات تک وہ مال نہیں آیا اور جب

ابوبکر کے زمانے میں آیا تو میں ان کے پاس گیا اور اس مال کا مطالبہ اپنے دعویٰ کے مطابق کیا۔ چنانچہ ابوبکر نے میرا دعویٰ تسلیم کرتے ہوئے وہ مال مجھے مرحمت فرمایا۔"

(صحیح بخاری ج ۲ جز ۲۷ ص ۱۹۰)

یہ دعویٰ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر کی عدالت میں کسی ایک عادل شخص کا زبانی دعویٰ بھی قابل قبول تھا خواہ وہ اس شخص کے ذاتی مفاد ہی کے لیے کیوں نہ ہو، کیونکہ ابوبکر نے اس مقدمہ میں جابر ابن عبداللہ سے ان کے دعویٰ کی صحت پر کوئی گواہ طلب نہیں کیا۔ اگر محض حسن ظن کی بنا پر بغیر کسی شہادت کے جابر کو مال کا دیا جانا جائز تھا تو ابوبکر کے دل میں رسولؐ کی بیٹی کے لیے یہ خوش اعتمادی کیوں نہیں تھی کہ وہ حصول فدک کے لیے (معاذاللہ) رسول پر افترا کا الزام نہیں رکھ سکتیں۔ اور اگر فاطمہ زہراؑ کی طرح گواہان طلب کرنے کا اصول ہمہ گیر اور عام تھا تو اس موقع پر بھی اس کا لحاظ ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ دور پیغمبرؐ میں بھی بعض مواقع پر اس اسلامی اور شرعی اصول کی پابندی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جب ایک اعرابی نے ایک اونٹ پر آنحضرتؐ سے تنازعہ کیا تو خزیمہ بن ثابت نے آپ کے حق میں گواہی دی اور اس ایک گواہی کو دو گواہوں کے برابر تسلیم کیا گیا کیونکہ جس کے حق میں یہ گواہی تھی اس کی صداقت اور دیانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لہٰذا جب پیغمبر کی صداقت کے پیش نظر ایک گواہی شرعی اعتبار سے کافی سمجھی گئی تو کیا جناب سیدہ کی اخلاقی عظمت اور راست گفتاری کے تحت حضرت علیؑ اور امّ ایمن کی گواہی کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا تھا؟

قاضی نوراللہ شوستری شہید ثالث نے احقاق الحق (باب المطاعن) میں تحریر فرمایا ہے کہ معترض کا یہ الزام کہ ام ایمن کی شہادت سے نصاب شہادت نامکمل رہتا ہے، اس بنا پر غلط ہے کہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک گواہ اور حلف سے بھی حکم فیصلہ لگانا جائز ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم قرآن منسوخ قرار

Presented by www.ziaraat.com

پائے کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حکم فیصلہ صادر ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اگر اس شہادت کے علاوہ کوئی اور معقول دلیل قابل قبول ہے تو اس کی بنا پر فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ اس جواب سے یہ امر واضح ہے کہ مدعی اپنے دعوٰی کے اثبات میں اس کا محتاج نہیں ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی ہی گواہی پیش کرے بلکہ اگر ایک گواہ کے ساتھ حلف بھی اٹھالے تو اس کو دعوٰی میں حق بجانب اور سچا سمجھنا چاہیے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دینا چاہیے۔

علامہ متقی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابو بکر، عمر اور عثمان وغیرہ ایک گواہی اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔

(کنز العمال ج ۴ ص ۶)

جب ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ ہوتا تھا تو حضرت ابو بکر کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی تسلی کے لیے اپنی گستاخانہ جسارت کو بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ ایک شہادت کے ہمراہ معصومہ سے حلف کا تقاضہ کر لیتے مگر یہاں تو مقصد ہی تھا کہ آپ کی صداقت پر ضرب لگا کر اسے مجروح کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی معاملہ میں آپ سے تصدیق کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو۔

جب اس طرح معصومہ عالم کا دعوٰی مسترد کر دیا گیا تو آپ نے میراث کی بنیاد پر اپنے حق کا مطالبہ کیا جیسا کہ عبد الکریم شہرستانی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ وراثت کی رو سے اپنے حق کا دعوٰی کیا اور ایک دفعہ ملکیت کی بنیاد پر مگر آپ کو اس مشہور روایت کی بنا پر محروم کر دیا گیا کہ پیغمبر نے فرمایا تھا ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

(کتاب الملل والنحل ص ۹)

اس قول پیغمبر کا علم ابو بکر کے علاوہ دیگر صحابہ میں سے کسی کو بھی نہیں تھا اور نہ کسی نے زبان پیغمبر سے اس حدیث کو سنا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کی میراث میں اختلاف پیدا ہوا اور کسی کے پاس اس کی کوئی اطلاع نہ تھی کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ اللہ کا برگزیدہ رسول اپنے حقیقی ورثاء کو یہ تک نہ بتائے کہ وہ وارث ہوں گے یا نہیں۔ اور جس شخص کو رسول اللہ کی وراثت سے دور کا بھی کوئی لگاؤ یا تعلق نہ ہو اس کو یہ اطلاع بہم پہنچا دے کہ ہم وارث نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ حدیث اس وقت بے نقاب ہو کر منظر عام پر آتی ہے کہ جب فدک کا مقدمہ دائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث اس وقت کہاں تھی جب حضرت ابو بکر نے جناب فاطمہ زہرا کا حق وراثت تسلیم کرتے ہوئے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر دیا تھا جسے حضرت عمر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

معلوم ہوا کہ فدک کے معاملات میں حضرات شیخین کی ملی بھگت تھی اور محض بے ایمانی اور دھاندلی کی بنا پر رسول کی قدسی صفات بیٹی کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔

ابو بکر سے سیدہ فاطمہ زہرا کی ناراضگی

اس ضمن میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک حضرت فاطمہ حیات رہیں اور ان کو ابو بکر سے شکوہ رہا اور اپنے انتقال تک ان سے کوئی رسم و راہ نہیں رکھی۔ بہر حال رشتہ داریوں اور جماعتوں میں ایسا بھی ہوتا

Presented by www.ziaraat.com

ہے اور بشریت کا تقاضہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جس پر یقین رکھتا ہے اور جس کو سچ سمجھتا ہے، اس کے لیے اس کے اندر ایک حساسیت بڑھ جاتی ہے اور جذباتیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک اختلاف ایک حد تک رہا اور حدودِ شرع سے متجاوز نہیں ہوا۔ ان کی مخالفت میں بھی شرافت، سیر چشمی، بلند ہمتی اور صبر کا جوہر قائم رہا۔ کیونکہ یہ اخلاق اُن کی سرشت میں داخل تھے۔ حضرت عامر سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے۔ اجازت طلب کی حضرت علیؑ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابوبکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دوں، حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوبکر اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی، اور وہ (حضرت فاطمہؑ) ان سے خوش ہو گئیں۔"

(المرتضیٰ ص ۱۴۲-۱۴۳)

۱۔ ندوی صاحب کا یہ فرمانا کہ وفات پیغمبر اسلامؐ کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا چھ ماہ تک حیات رہیں، نہ جانے تاریخ کی کس کتاب سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اپنی اس بات کے اثبات میں ندوی صاحب نے کسی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ دنیائے اسلام کے قدیم مورخ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا صرف ۷۵ دن دنیا میں رہیں۔

(الامامت والسیاست ج ۱ ص ۱۴)

علامہ بہائی نے تنوّدن تحریر فرمایا ہے (جامع عباسی ص ۷۵) اور انوار الحسینیہ

ج ۳ ص ۲۹ میں ہے کہ آپ کی تاریخ وفات ۳ جمادی الثانیہ ۱۱ھ ہے۔

۲۔ حضرت ابوبکر سے حضرت سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کو شکوہ رہا اور آپ نے وقت انتقال تک ان سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھی۔ ہمیں تسلیم ہے۔

۳۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رشتہ کی حیثیت سے ابوبکر حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی سوتیلی ماں عائشہ کے باپ تھے۔ اس نسبت سے آپ، معصومۂ عالمیہ کے سوتیلے نانا ہوئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "نانا جان" کی غیرت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اقتدار اور دنیا پرستی کی خاطر نانائیت کے فرائض کو بھول کر اپنی نواسی کی زندگی کو گہوارۂ آلام بنا دیں۔ اس کے شوہر سے بیعت کا تقاضہ کریں اور انکار بیعت کی صورت میں اپنے رفیق و ہمدم حضرت عمر کے ذریعہ اس کے گھر میں آگ لگوا دیں، ترکۂ پدری سے اسے محروم کر کے اس کی جائداد (فدک) پر قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر جائیں اور اپنے مظالم کی بنا پر اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیں کہ "مجھ پر وہ مصیبتیں ڈالی گئی ہیں کہ اگر روز ہائے روشن پر ڈالی جاتیں تو وہ سیاہ راتیں بن جاتے۔"

مولانا ندوی مجھے جواب دیں کہ کیا بشریت کا تقاضہ یہی تھا؟ کیا یقین کی منزل اسی کا نام ہے۔ کیا وہ سچ یہی ہے اور کیا ان مظالم براندام حالات کے بعد عقل سلیم اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ نے ابوبکر اور عمر کو معاف کر دیا ہوگا اور ان سے خوش ہو گئی ہوں گی؟

اصل واقعہ انتہائی اختصار کے ساتھ یوں ہے کہ جب حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ مقرر ہوئے تو اس کے بعد مسلمانوں سے جبریہ بیعت کی مہم شروع کی گئی، اور اسی ذیل میں ابوبکر کے مونس و ہمدم عمر اپنے غنڈوں کے ہمراہ جناب سیدہ کے گھر پہنچے، حضرت علی کو آواز دی اور کہا کہ اگر باہر نہیں نکلو گے تو میں

Presented by www.ziaraat.com

اس گھر میں آگ لگا دوں گا۔ گھر جلانے کے لیے آپ لکڑیاں بھی لے گئے تھے۔ سیدہ کونین دروازے تک پہنچیں اور پس پردہ رہ کر آپ نے عمر سے فرمایا کہ اے ابن خطاب یہ کیا ظلم ہے کہ تم لوگ ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کیا تمھیں رسول اللہ ؐ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ ہمارا گھر جلا دو۔ حضرت عمر نے کہا خدا کی قسم اگر تم لوگ بیعت نہیں کرو گے میں تمھارا گھر جلا دوں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمایا کہ اے پدر بزرگوار، اے رسول خدا، دیکھیے آپ کے بعد ہم پر کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ آخر کار حضرت عمر نے فاطمہؑ کے گھر میں آگ لگا دی اور آپ پر جلتا ہوا دروازہ گرا دیا جس کے نتیجہ میں جناب محسنؑ شکم مادر ہی میں شہید ہو گئے۔

حضرت علیؑ کے گلے میں رسی باندھ کر انھیں دربار خلافت میں لے جایا گیا اور ان سے بیعت کے لیے کہا گیا۔ حضرت نے قطعی طور پر ابو بکر کی بیعت سے انکار فرما دیا۔ اس پر حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اگر آپ بیعت نہیں کرنا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ گھر واپس آ گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے فرمایا کہ ہم نے فاطمہؑ کو ناراض کیا ہے، چلو ان کو راضی کر لیں۔ یہ دونوں حضرات فاطمہ زہراؑ کے بیت الشرف پر آئے اور اپنے افعال و اعمال پر معذرت چاہی۔ معصومہؑ نے فرمایا کہ میں تمھیں رسولؐ کی ایک حدیث سناتی ہوں کیا تم اس کی تصدیق کرو گے؟ حضرت ابو بکر اور عمر دونوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو قسم دے کر پوچھتی ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہؐ سے یہ حدیث نہیں سنی کہ: "فاطمہ میری رضا ہے اور غضب فاطمہ میرا غضب ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہ کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے اس کو خوش رکھا اس نے مجھ کو خوش رکھا اور جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض اور غضب ناک کیا۔

اس حدیث کو سن کر حضرت ابو بکر اور عمر دونوں نے اس کی تصدیق کی تب آپ نے فرمایا کہ: "میں خدا اور اس کے ملائکہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا ہے، اور جب میں رسولؐ خدا سے ملوں گی تو تم دونوں کی شکایت کروں گی۔"

حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اے فاطمہؑ میں آپ کے اور رسول خدا کے عتاب سے اور غضب سے پناہ مانگتا ہوں لیکن حضرت فاطمہ زہراؑ فرماتی جاتی تھیں اور یہاں تک فرمایا کہ خدا کی قسم میں ہر اُس نماز میں کہ جو میں پڑھوں گی تمھارے حق میں بد دعا کرتی رہوں گی۔ (الامامت والسیاست ابن قتیبہ مطبوعہ استنبول ص۱۴)

مذکورہ کتاب جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہے اس کے جزو اول ص ۱۲ تا ۱۴ پر بھی مذکورہ بالا عبارتیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ابو الفدا ج ۱ ص ۱۵۶، کتاب سقیفہ ابو بکر جوہری، تاریخ طبری، کنز العمال، تاریخ اعثم کوفی، روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب اور ارجح المطالب اردو ص ۳۱۳ وغیرہ میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی فرماتے ہیں کہ فاطمہؑ نے ابو بکر وغیرہ سے بات چیت کرنا چھوڑ دیا تھا اور آخری وقت یہ وصیت کی تھی کہ مجھے رات کے وقت دفن کرنا اور یہ لوگ میرے جنازے پر نہ آنے پائیں (امہات الامۃ ص ۹۹) علامہ عبد البر لکھتے ہیں کہ فاطمہ کی یہ وصیت تھی کہ حضرت عائشہ بھی شریک جنازہ نہ ہونے پائیں (استیعاب ج ۲ ص ۷۷)

جناب سیدہ کی حضرات شیخین کی ناراضگی کے بارے میں مولانا علی میاں ندوی اگر مطمئن نہ ہوئے ہوں تو مزید ملاحظہ فرمائیں۔ ترجمہ صواعق محرقہ ص ۲۱ اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۴۸۰، الزہرا، عمر ابو نصر (اردو ترجمہ) ص ۸۹، جمع الفوائد

Presented by www.ziaraat.com

ج ۲ ص ۱۸ مطبوعہ میرٹھ، ترجمہ صحیح مسلم ج ۵ ص ۲۵، روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۲۳۴ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۵۷ وغیرہ۔

سیدۂ کونین حضرت فاطمہ زہراؑ کی رحلت

مولانا ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے۔" (المرتضیٰ ص ۱۴۳)

حضرت ابن عباس صحابی رسول کا بیان ہے کہ جب فاطمہ زہرا کی رحلت کا وقت قریب آیا تو نہ معصومہ کو بخار آیا، نہ درد سر عارض ہوا، بلکہ آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو ساتھ لیا اور قبر رسول پر گئیں اور قبر و منبر کے درمیان دو رکعت نماز پڑھی پھر دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر فرمایا کہ اے بچو! تم دونوں تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بیٹھو۔ امیر المومنین اس وقت مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر وہاں سے گھر آئیں اور آنحضرت کی چادر اٹھائی، غسل کر کے رسول اللہ کا بچا ہوا کفن یا لباس پہنا۔ بعد ازاں آپ نے اسماء (زوجہ حضرت جعفر طیار) کو آواز دی اور فرمایا اسماء، تم مجھ سے الگ نہ ہونا، میں ایک ساعت کے لیے اس حجرہ میں جاتی ہوں اور جب تھوڑا وقفہ گزر جائے اور میں باہر نہ نکلوں تو مجھ کو تین آوازیں دینا۔ اگر میں جواب نہ دوں تو تم اندر چلی آنا اور سمجھ لینا کہ میں رسولؐ خدا سے ملحق ہو چکی ہوں۔

اس کے بعد آپ حجرہ میں تشریف لے گئیں اور آنحضرت کی جگہ کھڑی ہو کر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی پھر لیٹ گئیں اور اپنا منھ چادر سے ڈھانپ لیا بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیدہ نے حالت سجدہ میں ہی وفات پائی۔ الغرض جب

ایک ساعت کا وقفہ گزر گیا تو اسماء نے آپ کو آواز دی، مگر جواب نہ ملا، تب اسماء اس حجرہ میں داخل ہوئیں اور دیکھا کہ معصومہ رحلت فرما چکی ہیں۔ اسماء نے اپنا گریبان پھاڑ لیا اور روتی پیٹتی گھر سے نکل کر صحن مسجد میں آئیں جہاں حسنینؑ ماں کا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں نے اسماء کو روتا دیکھ کر گھبرا کر پوچھا کہ اے اسماء، ہماری اماں کہاں ہیں۔ عرض کی کہ حجرہ میں ہیں۔ دونوں شاہزادے حجرہ میں پہنچے دیکھا کہ مادر گرامی دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ شاہزادے روتے ہوئے حضرت علیؑ کے پاس آئے اور انھیں خبر دی۔ آپ صدمہ سے بے حال ہو گئے اور گھر میں تشریف لائے۔ اسماء سرہانے بیٹھی مصروف گریہ تھیں۔ آپ نے چہرۂ انور کو کھول کر دیکھا۔ سرہانے ایک تحریر دستیاب ہوئی جس میں شہادتین کے بعد وصیت پر عمل کا حوالہ تھا اور یہ تاکید تھی کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے غسل دیکر کفن پہنانا اور رات کے وقت سپرد خاک کرنا اور میرے دشمنوں (ابوبکر اور عمر) کو میری میت پر نہ آنے دینا۔ آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں تمھیں خدا کے سپرد کرتی ہوں اور اپنی ان تمام اولادوں (سادات) کو سلام کرتی ہوں جو قیامت تک پیدا ہوتی رہیں گی۔

جب رات ہوئی تو حضرت علیؑ نے غسل دیا، کفن پہنایا، نماز پڑھی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔ (زاد العقبیٰ ترجمہ مودۃ القربیٰ علی ہمدانی شافعی ص ۱۲۵ تا ۱۲۹)

انوار الحسینیہ ج ۳ ص ۳۹ میں ہے کہ آپ منبر اور قبر رسول کے درمیان دفن ہوئیں۔ کتب مقاتل میں ہے کہ غسل کے وقت حضرت علی علیہ السلام نے پشت و بازوئے فاطمہؑ پر دُرّۂ عمری کے نشانات دیکھے تھے اور بے چیخ مار کر رو دیے تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوبکر وغیرہ کو شرکت کی اجازت نہیں دی اور نماز جنازہ خود پڑھی۔ علامہ عینی شارح بخاری لکھتے ہیں کہ

Presented by www.ziaraat.com

یہ سب کچھ حضرت علیؑ نے فاطمہ زہراؑ کی وصیت کے مطابق کیا تھا۔

الغرض غسل وکفن کے بعد آپ اپنی اولاد اور اپنے اعزا کے ساتھ جنازہ لے کر روانہ ہوئے۔ کتاب الفتن میں ہے راستہ دیکھنے کے لیے ایک شمع ساتھ تھی اور حضرت زینبؑ جو کافی کم سن تھیں سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی اس سائے میں چل رہی تھیں جو تابوت کے نیچے شمع کی وجہ سے زمین پر پڑ رہا تھا، مودۃ القربیٰ ص ۲۹ میں ہے کہ حضرت علیؑ جب جنت البقیع میں پہنچے تو ایک سمت سے آواز آئی اور کھدی کھدائی قبر نمایاں ہو گئی۔ حضرت علیؑ نے اسی قبر میں جناب فاطمہؑ کی لاش مطہر دفن کی اور زمین اس طرح برابر کر دی کہ نشان قبر نہ معلوم ہو سکے۔ کتاب منتہی الآمال شیخ عباس قمی ص ۱۳۹ میں ہے کہ جب جناب سیدہ کی لاش قبر میں اتاری گئی تو رسول خدا کے ہاتھوں کے مانند دو ہاتھ نمودار ہوئے اور انھوں نے جسم مطہر سیدہ کو سنبھال لیا۔ دلائل الامۃ میں ہے کہ چونکہ قبر فاطمہؑ کے ساتھ بے ادبی کا اندیشہ تھا اس لیے چالیس قبریں بنا دی گئی تھیں۔ مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ چالیس قبریں اس لیے بنائی گئی تھیں کہ صحیح قبر معلوم نہ ہو سکے اور فاطمہؑ کو ستانے والا قبر پر بھی نماز نہ پڑھ سکے ورنہ سیدہ کو اذیت ہوگی۔ اس کے باوجود لوگوں (ابوبکر وغیرہ) نے قبر کھود کر نماز جنازہ پڑھنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں حضرت علیؑ ننگی تلوار لے کر زرد لباس پہنے ہوئے قبر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت آپ کے منھ سے کف جاری تھا، یہ دیکھ کر لوگوں کی ہمتیں پست پڑ گئیں اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔

علامہ حافظ محمد بن علی شہر آشوب المتوفیٰ ۵۸۸ھ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کے جنازے میں امیر المومنین حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، سلمان فارسی، ابوذر، مقداد، عمار اور بریدہ شریک

تھے اور انھیں لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ ایک روایت میں عباس، فضل، حذیفہ اور ابن مسعود کا اضافہ ہے۔ طبری میں ابن زبیر کا بھی تذکرہ ہے۔
(عمدۃ المطالب ترجمۂ مناقب ج ۲ ص ۶۵ مطبوعہ ملتان)

حضرت فاطمہ زہراؑ کے جائے دفن میں اختلاف ہے۔ کوئی جنت البقیع کوئی قبر اور منبر رسولؐ کے مابین اور کوئی گھر اور قبر پیغمبرؐ کے درمیان بتاتا ہے۔ مشہور یہی کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں۔ لیکن احمد بن محمد بن ابی نصر نے امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ اپنے ہی گھر میں مدفون ہوئیں اور جب بنی امیہ نے مسجد کی توسیع کی تو آپ کی قبر روضۂ رسولؐ کے اندر آ گئی۔ (ترجمہ مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۶۹)

انوار الحسینیہ ج ۱ ص ۵۴ مطبوعہ بمبئی ۱۳۴۶ھ میں ہے کہ ابن سعود نے جذبۂ وہابیت سے متاثر ہو کر قبر معصومۂ عالم کو منہدم کرا دیا۔ شیخ العراقین محمد رضا کا کہنا ہے کہ ابن سعود نے مکہ میں ۹۰ اور مدینہ میں انیس ۱۹ مقامات مقدسہ کو منہدم کرایا تھا جن میں خانۂ سیدہ اور بیت الحزن بھی شامل ہے۔
(اقتباسات چودہ ستارے)

حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبر اسلام کی نظر میں

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں معصومۂ کونین حضرت فاطمہ زہراؑ کی منزلت یہ تھی کہ آپ انھیں "ام ابیہا" یعنی اپنے باپ کی ماں کہہ کر مخاطب فرماتے تھے اور جب معصومہ تشریف لاتی تھیں تو آپ سرو قد تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کی فضیلت میں رسول اللہؐ کی اس قدر حدیثیں موجود ہیں کہ ایک کتاب الگ سے مرتب ہو سکتی

Presented by www.ziaraat.com

ہے۔ لیکن یہاں مقصد صرف ان حدیثوں کو پیش کرنا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ فاطمہ زہراؑ کو ایذا پہنچانے والا اللہ اور رسول کی نگاہ میں کیا مقام رکھتا ہے۔

۱۔ ارشاد پیغمبرؐ ہے کہ اللہ، فاطمہؑ کے غضب سے غضب میں آتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے خوش ہوتا ہے۔ (مستدرک حاکم و جامع ترمذی)

۲۔ فرمایا رسولِ خداؐ نے کہ فاطمہؑ میرا جزو ہے جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھ کو غضب ناک کیا اور جس نے اس کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی۔

۳۔ فرمایا پیغمبرؐ نے کہ فاطمہؑ میرا دل اور میری روح ہے جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور کافر ہوا۔

۴۔ فرمایا رسولِ خداؐ نے کہ فاطمہؑ میرا نور، میرا جزو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور فاطمہؑ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے۔ (صحیح بخاری باب ۱۴ ص ۳۹۰ صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۹۰، جامع ترمذی ص ۷،۵۴، کنزالعمال ص ۹۷، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۴)

مذکورہ اقوال پیغمبرؐ سے واضح ہے کہ سیدہ فاطمہ زہراؑ کو ناراض کرنے والا اور آپ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے اور قرآن بھی کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کو ایذا پہنچاتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ اللہ کی لعنت ہے۔

اس اعتبار سے فاطمہ زہراؑ کی ایذا رسانی کے بعد، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شخصیت کا تعین مولانا ندوی خود فرمالیں

خلافت کی واپسی

حضرت ابوبکر کو جب مرض الموت نے اپنے شکنجے میں جکڑا اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ اب بچنا محال ہے تو آپ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آپ خلافت کو اسی شخص کے حوالے کر جائیں جس کی یہ مرہون منت ہے۔ چنانچہ اپنی علالت کے دوران آپ نے حضرت عمر کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ جب مسلمانوں کو آپ کی اس نیت کا پتہ چلا تو انصار و مہاجرین پر مشتمل ایک وفد طلحہ و زبیر کی قیادت میں آپ سے ملا اور احتجاج کرتے ہوئے آپ سے درخواست گذار ہوا کہ حضرت عمر انتہائی غلیظ طبیعت کے انسان ہیں اور جب آپ کی موجودگی میں ان کے مظالم کی تلوار کا لوہا ہم مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گرم رہتا تھا تو خلیفہ ہو جانے کے بعد وہ نہ جانے کیا کریں گے۔ اور ہم یہ اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں کہ آپ ہم پر حضرت عمر کو خلیفہ بنا کر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا وقت آخر ہے اور اب اللہ کے گھر جا رہے ہیں آخر وہاں کیا جواب دیں گے۔ لہذا آپ اپنے اس ارادے سے باز آئیں۔ (تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۵۴ الفاروق ص ۲۷ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۹ وغیرہ) لیکن حضرت ابوبکر چونکہ حضرت عمر کی خلافت کے بارے میں اپنے دل میں ٹھان چکے تھے اور مکمل فیصلہ کر چکے تھے لہذا انھوں نے طلحہ و زبیر وغیرہ کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے انھیں سختی سے جھڑک دیا اور فرمایا کہ یہ لباس خلافت مجھے تم لوگوں نے نہیں پہنایا بلکہ اسے میرے محسن عمر بن خطاب نے مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کو انھیں ضرور واپس کروں گا۔ (خلاصۂ عبارت ابوبکر، مترجم محمد احمد پانی پتی ص ۵۰۴)

الغرض حضرت ابوبکر کی حالت جب بگڑنے لگی تو آپ نے حضرت عثمان کو

Presented by www.ziaraat.com

بلایا اور کہا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ اور جو کچھ میں لکھوانا چاہتا ہوں اسے لکھو۔ عثمان کاغذ و قلم لے آئے اور کہا کہ کیا لکھوں۔ فرمایا کہ لکھو، حکم نامہ منجانب ابوبکر بن قحافہ بنام امت مسلمہ، امابعد ....، ابوبکر اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان ابوبکر کا مقصد سمجھ گئے تھے لہذا انھوں نے یہ تحریر فرمادیا کہ میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا اور خیر میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر ہوش میں آئے تو انھوں نے عثمان سے کہا کہ پڑھو کیا لکھا ہے جو لکھا تھا اسے عثمان نے پڑھ کر سنا دیا جس پر خوش ہو کر ابوبکر نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا کہ شاید تمھیں بھی اس امر کا خوف پیدا ہوا کہ اگر میں بے ہوشی کی حالت میں مر گیا تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ عثمان نے کہا کہ ہاں۔ اس پر ابوبکر نے فرمایا کہ اللہ تمھیں جزائے خیر دے (تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۶۳، تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۲۵، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۸)

حضرت ابوبکر نے اس وصیت نامہ کو اپنے غلام کے ذریعہ عام مسلمانوں میں مشتہر کرایا۔ مشتہری کے وقت حضرت عمر، حضرت ابوبکر کے غلام کے ساتھ ساتھ رہے۔ طبری کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے ہلا ہلا کر یہ کہتے جاتے تھے کہ اے مسلمانو! خلیفۂ رسول نے جو کچھ اس وصیت نامہ میں لکھا ہے اسے تمھیں ماننا ہوگا۔ (خلاصۂ تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۲) اتمام نعمت میں ہے کہ ڈنڈے کے زور پر یہ بیعت، بیعت بالجبر تھی اسے بالرغبت نہیں کہا جاسکتا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ خدا کا رسول جب وصیت کے لیے قلم دوات اور کاغذ طلب کرے تو اس کے اس عمل کو ہذیان سے تعبیر کر دیا جائے اور بستر مرگ پر جب حضرت ابوبکر وصیت لکھوائیں تو اس کو ڈنڈے کے زور سے مسلمانوں پر نافذ کیا جائے۔

مولانا ابوالحسن ندوی کا کہنا ہے کہ: "حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت عمر کو اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروق میں قوت فیصلہ مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔"

(المرتضیٰ ص ۱۶۳، ۱۶۴)

بے شک حضرت عمر میں قوت فیصلہ ایسی ہی تھی کہ جس نے ایک منزل میں رسول اللہؐ کا قصہ ہی پاک کر دینا چاہا اور ایک منزل میں اس نے آپ کو رسولؐ کی رسالت پر شک کرنے پر مجبور کر دیا اور مستقل مزاجی کا یہ حال تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزل میں آپ کبھی مستقل مزاج نہ رہ سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ محمدؐ و آل محمدؐ کی دشمنی اور لات و ہبل کی پرستش میں ہمیشہ مستقل مزاج رہے، جس کا اعتراف ہمیں بھی ہے۔ اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی کے بارے میں صرف اتنا ہی تبصرہ کافی ہے کہ اس نے جب خام سیاست کا لباس زیب تن کیا تو انسانیت برہنہ ہو گئی۔

واقعۂ قرطاس

واقعۂ قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"صحیح بخاری میں حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری وقت آیا اس وقت گھر میں کچھ لوگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آؤ تمھارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہونے پاؤ۔ کچھ لوگوں نے

Presented by www.ziaraat.com

کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف زیادہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ اس معاملے میں گھر والے ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ ان میں کوئی کہتا تھا کہ (کاغذ قلم) آپ کے قریب کردو تاکہ تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم راہ سے نہ بھٹک سکو۔ کچھ لوگ اس کے خلاف کہہ رہے تھے مگر جب زیادہ گفتگو بڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "چلے جاؤ"۔

(الجامع الصحیح للبخاری کتاب المغازی باب مرض النبی ووفاتہ)

پھر مزید تحریر فرماتے ہیں:۔

"کاغذ طلب کرنے کے بعد تین روز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں فرمایا اور خلافت کے سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا۔ آپ نے جو وصیتیں کیں ان میں یہ تھا کہ نماز اور ان لوگوں کا خیال جو تمہارے زیر نگیں (غلام اور باندیاں) ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، زکواۃ اور غلام اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔"

(المرتضیٰ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی مذکورہ گفتگو کی دلیل میں صحیح بخاری اور رواہ البیہقی واحمد کا نام تو لیا ہے مگر جلد نمبر اور صفحہ نمبر کی وضاحت نہیں کی جس سے آپ کی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو کی صداقت پر شک ہوتا ہے اور

نہ ایسی کوئی روایت صحیح بخاری وغیرہ میں میری نظر سے گزری ہے۔ اس لیے مولانا ندوی کی اس گفتگو پر تبصرہ کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعۂ قرطاس کو از سر نو تاریخی حوالوں کی روشنی میں پیش کیا جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کی واپسی پر اپنی جانشینی کا اعلان حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حق میں مرضی الٰہی کے مطابق کر چکے تھے۔ آخری لمحات میں آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ اسے دستاویزی شکل دے دوں۔ چنانچہ آپ نے اصحاب سے فرمایا کہ مجھے کاغذ، قلم اور دوات مہیا کردو تاکہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ تحریر کر دوں جو تمھیں گمراہی سے بچائے رکھے۔ یہ سن کر اصحاب میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں کے رجحانات قلم و دوات دے دینے کی طرف دیکھ کر حضرت عمر نے کہا کہ یہ مرد ہذیان بک رہا ہے، ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔ (صحیح بخاری پ ۳ ص ۸۴۲)

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے آنحضرت کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (الفاروق ص ۶۱)

مولوی نذیر احمد خاں دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ "جن کے دل میں تمنائے خلافت چٹکیاں لے رہی تھی انھوں نے تو دھینگا مشتی سے منصوبہ ہی چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی یہ تاویل کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے اور چونکہ اس وقت پیغمبر صاحب کے حواس برجا نہیں ہیں۔ کاغذ و قلم و دوات کا لانا کچھ ضروری نہیں، خدا جانے کیا لکھوا دیں"۔ (امہات الامۃ ص ۹۲) اس واقعہ سے آنحضرتؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے فرمایا 'قوموا عنی'، میرے پاس سے چلے جاؤ۔ نبی کے روبرو شور و غل انسانی ادب نہیں ہے۔

امام ابوالحامد محمد الغزالی لکھتے ہیں کہ غدیر خم میں حضرت رسول کریمؐ کے

Presented by www.ziaraat.com

"من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ" فرمانے کے بعد اور موقع پر مبارک باد دینے کے بعد جب لوگوں پر خلافت کی ہوا و ہوس غالب آگئی تو انھوں نے غدیر خم کی تمام باتیں بھلا دیں پھر جب رسول خدا کے انتقال کا وقت آیا تو انھوں نے وفات سے قبل فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تاکہ میں دستاویزی طور بر خلافت کے اشکال کو دور کر دوں اور تمھیں تحریر کے ذریعہ بتا دوں کہ میرے بعد خلافت کا حق دار کون ہے؟ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا کہ اس مرد کو چھوڑ دو یہ ہذیان بک رہا ہے (سر العالمین ص ۹ مطبوعہ بمبئی) یہ عبارت مختلف الفاظ میں صحیح بخاری طبع کراچی ج ۱ ص ۱۳۴، ۱۳۵ و ج ۲ پ ۱۸ ص ۶۹۶ و ج ۳ پ ۳۰ ص ۸۴۲، ۸۴۳ و صحیح مسلم جلد ۵ ص ۷۶ و فتح الباری شرح بخاری عسقلانی ج ۱ ص ۱۲۹ بر حاشیہ و جزو ۸ ص ۱۰۱ نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض طبع مصر جز ۴ ص ۲۷۸ شرح شفا مُلّا علی قاری بر حاشیہ نسیم الریاض، مدارج النبوۃ طبع کان پور ص ۵۴۲، حبیب السیر ج ۱ ص ۷۹ و مکتوبات شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ج ۲ ص ۶۱ - ۶۲ وغیرہ میں بھی ہے۔

انھیں کتابوں کی روشنی میں خواجہ حسن نظامی دہلوی لکھتے ہیں: اسی بیماری کے زمانہ میں ایک دن بہت سے لوگ حضرت صلعم کے پاس جمع تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ لاؤ کاغذ میں تم کو کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔ یہ سن کر (حضرت عمر) بولے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بخار کا غلبہ ہے اس لیے ایسا فرماتے ہیں۔ وصیت نامہ کی کچھ ضرورت نہیں ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے۔ (محرم نامہ ص ۱۰ مطبوعہ دہلی)

علامہ طریحی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، ابو عبیدہ، عبد الرحمٰن اور سالم ان پانچ آدمیوں نے خانہ کعبہ میں قسم کھائی تھی کہ پیغمبر کے بعد ہم خلافت

کو خاندانِ بنی ہاشم میں نہ جانے دیں گے۔ (مجمع البحرین)

یہ واقعہ حدیث قرطاس کی شکل میں مذکورہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ندوی صاحب کی چشم وہابیت میں ایسی بصیرت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکے۔

انتقال

حضرت ابوبکر نے دو سال تین ماہ گیارہ دن تخت خلافت پر قابض رہ کر ۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۳ھ مطابق ۲۲ر اگست ۶۳۴ء پیر کے دن انتقال کیا۔ آپ کے دور خلافت میں خاص بات یہ تھی کہ توسیع حکومت اور حصول اقتدار کے نام پر اسلام کا سہارا لے کر تقریباً دو لاکھ اٹھارہ ہزار بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا کشت و خون کی اس ہولی میں زیادہ تر خالد بن ولید کا ہاتھ رہا۔

حضرت ابوبکر نے اپنی حیات میں پانچ عورتوں سے عقد جائز کیا۔ آپ کی کل چھ اولادیں تھیں۔ لڑکوں میں عبد الرحمٰن، عبد اللہ اور محمد تھے اور لڑکیوں میں حضرت عائشہ، اسماء اور ام کلثوم تھیں۔ حضرت عائشہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں تھیں، اسماء کے شوہر زبیر بن عوام تھے اور ام کلثوم سے حضرت عمر نے عقد فرمایا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حضرت ابوبکر کے والد قحافہ نے ۹۷ سال کی عمر پائی تھی۔ ۹ھ میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور ۱۴ھ میں انتقال فرما گئے۔ اس طرح آپ نے کل پانچ سال مسلمان رہ کر ۹۲ سال کفر کی زندگی گذاری۔

مدفن

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر دونوں ہی رسول اللہ

Presented by www.ziaraat.com

کے اردگرد حجرۂ عائشہ میں دفن ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حجرہ میں یہ لوگ دفن ہیں کیا وہ واقعی عائشہ کی ملکیت تھا؟ اس کے جواب میں صاحب کتاب اصحاب ثلاثہ نے ج ۱ ص ۱۵ تا ۵۳ امام ابوحنیفہ اور فضال کوفی کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فضال کوفی: اے ابوحنیفہ میرا ایک بھائی ہے جو حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو شیخین (حضرت ابوبکر و عمر) سے افضل سمجھتا ہے۔

ابوحنیفہ: شیخین کی افضلیت تو پہلوئے رسولؐ میں دفن ہونے سے ہی ظاہر ہے۔

فضال کوفی: یہ بات میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی، مگر وہ کہتا ہے کہ اگر وہ حجرہ آنحضرتؐ کی ملکیت تھا تو دونوں نے اس میں دفن ہو کر ظلم کیا اس لیے کہ انھیں رسول اللہ کے حجرہ میں دفن ہونے کا کوئی حق نہیں تھا اور اگر وہ حجرہ شیخین ہی کا تھا اور انھوں نے رسولؐ کو ہبہ کر دیا تھا تو ہبہ کے بعد بغیر اجازت رسولؐ اس پر تصرف ناجائز تھا اور رسول اللہؐ سے اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

ابوحنیفہ: وہ حجرہ شیخین کی تدفین کے وقت نہ شیخین کا تھا نہ رسول اللہ کا، بلکہ شیخین اپنی اپنی بیٹیوں عائشہ اور حفصہ کے حصہ میں دفن ہیں۔

فضال کوفی: یہ بات بھی میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی مگر اس نے جواب دیا کہ تم تو جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کی نو بیویاں تھیں لہذا شریعت محمدی کی رو سے اس حجرہ کے آٹھویں حصہ کی وارث حفصہ اور نویں حصہ کی وارث عائشہ قرار پاتی ہیں، اور ان دونوں کی زمین کا رقبہ دو بالشت سے بھی کم ہوتا ہے، لہٰذا اتنی تنگ جگہ میں دو طویل القامت آدمی کیونکر دفن ہو گئے اور عائشہ و حفصہ کے علاوہ دیگر سات بیویوں سے اجازت کیوں نہیں لی گئی؟ اس کے علاوہ

رسولؐ کے ترکہ کی وارث عائشہ اور حفصہ کیوں کر ہو سکتی ہیں جب کہ رسول کی بیٹی فاطمہؑ کو میراث پدری سے محروم رکھا گیا۔

اس مختصر مکالمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حجرہ کے اصل وارث پیغمبر اسلامؐ تھے اور آپ کے بعد آپ کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا اس حجرہ کی وارث ہوئیں۔ حجرے کے اندر حضرات شیخین کا دفن کیا جانا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب معصومہؑ سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو، اور معصومہؑ سے حصول اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور اگر اس پہلو پر غور کیا جائے کہ معصومہؑ کی حیات میں ہی ان سے اجازت حاصل کر لی گئی تھی تو اس کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ سیدہ فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا شیخین سے ناراض اس دنیا سے رخصت ہوئیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

معلوم ہوا کہ شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کا مدفن بھی غاصبانہ ہے۔

حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے حق کیلئے تلوار نہ اٹھانے کا سبب

بعض نافہم یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے بعد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام خاموش کیوں رہے اور آپ نے اپنے حق کی خاطر غاصبوں سے جنگ کیوں نہیں کی؟۔

یقیناً حالات اسی منزل میں تھے اور اس جان لیوا ماحول اور سخت گیر مصائب کے عالم میں امیر المومنین کی جگہ عام ذہن و فکر کا کوئی دوسرا انسان ہوتا تو خونریزی لازمی تھی۔ لیکن اس سخت ترین منزل میں حضرت علیؑ کی حکیمانہ خاموشی نے دور اندیشی اور مصلحت بینی سے کام لے کر نہ صرف رسولؐ کی محنتوں اور مشقتوں کو رائگاں

Presented by www.ziaraat.com

ہونے سے بچا لیا بلکہ اسلام کی کشتی کو فنا کے گرداب اور طوفان سے نکال کر اُسے دائمی اور ابدی زندگی دے دی۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ حضرت علیؑ کی دلیری ہمت اور شجاعت کا یہ عالم تھا کہ فوجوں کے ریلے آپ کے ثبات قدم کو جنبش نہ دے سکتے تھے۔ ہر معرکہ کی فتح یابی اور کامرانی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا کرتا تھا اور بہادر سے بہادر نبرد آزما بھی آپ کی تلوار سے بچ کر جانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا۔ آپ نے جس سے بھی مقابلہ کیا اسے پچھاڑے بغیر نہ چھوڑا۔

شجاعوں کی منچلی طبیعتیں سوچ بچار کی عادی نہیں ہوا کرتیں اور نہ مصلحت بینی و مآل اندیشی سے انھیں کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر آپ میں شجاعت کے ساتھ سوجھ بوجھ کا مادہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ امام شافعی کا قول ہے کہ میں اس ہستی کے بارے میں کیا کہوں جس میں تین صفتیں ایسی تین صفتوں کے ساتھ جمع تھیں جو آج تک کسی بھی انسان میں جمع نہیں ہوئیں (۱) فقر کے ساتھ سخاوت (۲) شجاعت کے ساتھ تدبر (۳) علم اور رائے کے ساتھ عملی کارگذاریاں۔

اسی اصابت فکر و صحت رائے کا نتیجہ تھا کہ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ابوسفیان نے آپ کو اپنے حق کے لیے تلوار اٹھانے کا مشورہ دیا اور فوجوں کی فراہمی کا وعدہ کیا تو آپ نے اس کے مشورہ کو ٹھکرا دیا حالانکہ ایسے موقعوں پر بہادروں کو ابھارنے کے لیے ذرا سا بھی سہارا کافی ہوتا ہے، مگر آپ کی طبع دور اندیش نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اگر اس وقت معرکۂ کارزار گرم ہو گیا تو سارا مدینہ خون میں ڈوب جائے گا اور اسلام کی آواز تلواروں کی جھنکار میں دب کر رہ جائے گی اور پھر کامیابی حاصل ہوئی تو یہی کہنے میں آئے گا کہ تلوار کے زور سے اس منصب کو حاصل کیا ورنہ کوئی استحقاق نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے تلوار روک کر ایک طرف تو اسلام کی حفاظت

کا سامان فراہم کیا اور دوسری طرف اپنے حق کو خوں ریزیوں سے داغدار نہ ہونے دیا۔ جہاں رگ و پے میں شجاعت کا خون دوڑ رہا ہو اور سینے میں غیظ و غضب کی چنگاریاں بھڑک رہی ہوں وہاں ولولۂ انتقام کو دبا کر عفو و بخشش کا طرز عمل اختیار کرنا اور طاقت کے ہوتے ہوئے درگذر سے کام لینا بڑی کٹھن اور امتحانی منزل ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ دیکھو رسول اللہؐ دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ مجھ سے خلافت کے بارے میں کوئی نزاع نہ کرے، لیکن ان لوگوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ خدا کی قسم اگر دین میں تفرقہ پڑنے اور کفر کے پلٹ آنے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان کی ساری کارروائیاں آن واحد میں پلٹ دیتا۔ (استیعاب ج۱ ص ۱۸۳ مطبوعہ حیدر آباد)

فتح الباری فی شرح بخاری ج۴ ص ۲۰۴ سے واضح ہے کہ حضرت علیؑ نے اسی طرح چشم پوشی اختیار کی جس طرح کفر کے پلٹ آنے کے خوف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے ساتھ کرتے تھے۔ چنانچہ تفسیر کبیر ج۲ ص ۶۸۶، سیرت محمدیہ ص ۳۵۶، سیرت حلبیہ ص ۳۶۰ اور تاریخ خمیس ج۲ ص ۱۳۹ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرتؐ، عائشہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تیری قوم نو مسلم نہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ لازم و ملزوم تھے۔ لہٰذا جن وجوہ کی بنا پر رسول اللہ نے ان منافقوں سے جنگ نہیں کی، انھیں وجوہ کی بنا پر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تلوار نہیں اٹھائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت ابوسفیان مدینہ میں موجود نہیں تھا۔ کہیں سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس المناک واقعہ کی خبر ملی۔ اس نے پوچھا کہ مسلمانوں کی قیادت و امارت کسے ملی؟ بتایا گیا کہ لوگوں نے

Presented by www.ziaraat.com

ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ یہ سن کر عرب کا مانا ہوا فتنہ پرداز سوچ میں پڑ گیا اور آخر کار ایک تجویز لے کر عباس ابن عبدالمطلب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ دیکھو ان لوگوں نے دھاندلی مچا کر خلافت ایک تیمی کے حوالے کر دی ہے اور بنی ہاشم کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ خلیفہ اپنے بعد بنی عدی کے ایک درشت مزاج کو ہمارے سروں پر مسلط کر جائے گا۔ چلو، علیؑ ابن ابی طالبؑ سے کہیں کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑیں اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ وہ عباس کو لے کر علیؑ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپ ہاتھ بڑھائیں، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ اگر کوئی مخالفت پر آمادہ ہوا تو میں مدینہ کی گلیوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے لیے یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی جگہ پیغمبرؐ کے صحیح وارث و جانشین تھے اور ابوسفیان جیسا جتھے قبیلے والا آپ کے سامنے کھڑا تھا جو ہر طرح آپ کی مدد پر آمادہ تھا صرف ایک ہی اشارہ کافی تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ مگر امیرالمومنین کے تدبر نے مسلمانوں کو فتنہ و فساد اور کشت و خون سے بچا لیا اور آپ کی دور رس نظروں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ قبائلی تعصب اور نسلی امتیاز کو ابھار کر خوں ریزی کرانا چاہتا ہے تاکہ اسلام میں ایک ایسا زلزلہ آئے اور خون کا ایسا دھماکہ ہو جو اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے۔ لہذا آپ نے اس کی تجویز کو نہایت سختی سے ٹھکرا کر اسے جھڑک دیا۔

اس موقع پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خاموشی، مصلحت بینی اور دور اندیشی اصابت فکر کی آئینہ دار تھی۔ کیوں ان حالات میں اگر مدینہ مرکز جنگ بن جاتا تو اس کی آگ سارے عرب کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی اور مہاجرین و انصار میں جس رنجش کی ابتدا ہو چکی تھی وہ بڑھ کر اپنے انتہا کو پہنچ جاتی۔ منافقین کی

ریشہ دوانیاں اپنا کام کرتیں اور اسلام کی کشتی ایسے گرداب میں پڑ جاتی کہ پھر اس کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔

(اقتباسات نہج البلاغہ)

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourrier.com

Presented by www.ziaraat.com

بنی ہاشم

مذکورہ عنوان کے تحت مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں :۔

"قریش کی شاخ اپنے انسانی شعور اور اعتدال پسندی میں امتیاز رکھتی تھی۔ دینی اور دماغی طور پر بھی اس کو کسی قدر فوقیت حاصل تھی، بیت اللہ (خانۂ کعبہ) کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام و مرتبہ تھا اس پر پختہ ایمان رکھتی تھی۔ گناہ کو سمجھنے کا شعور ختم نہیں ہوا تھا۔ ہٹ دھرمی اور ضد اس کا شعار نہیں تھا۔ ہمت بلند تھی۔ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم و شفقت کا برتاؤ کرتی تھی۔ سخاوت و شجاعت اس کا مزاج تھا۔ غرض اخلاق و شرافت، سیر چشمی، حمیت اور جوش عمل کی وہ خصوصیات جس کے لیے عربی میں ایک جامع لفظ "فروسیت" کا ہے، بنی ہاشم میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان کے اخلاق و سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء و اجداد کے شایانِ شان تھے اور اسلام نے جن اخلاق عالیہ کی دعوت دی ہے ان سے ان کے اخلاق مناسبت رکھتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ تک وہ اپنی قوم و ہم وطن قبائل کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں شریک ہو گئے تھے۔"

(المرتضیٰ ص ۳۱-۳۲)

خط کشیدہ عبارت میں مولانا ندوی نے اپنے جس موقف اور مقصد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کا کوئی وجود تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ بنی ہاشم پر اس الزام تراشی کے جواز میں کسی مورخ کے قلم میں جنبش ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی اسناد سے مایوسی کے بعد مولانا موصوف نے خود اپنی ہی کتاب کا حوالہ پیش کر کے اپنے دل کی تسلی کر لی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مولانا کا یہ عمل اور طریقۂ کار عام مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے اور انھیں دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ بہر حال ۔۔۔ یہ ایک کلیہ، ایک حقیقت، دنیاوی مشاہدہ اور اصول فطرت ہے کہ انسان کے طور و طریقوں، طرز حیات و معاشرت، اخلاق و تہذیب، خصائل و شمائل عادات و اطوار اور سیرت و کردار کا سرمایہ وراثتاً اس کی اولاد اور نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا بنی ہاشم کی فضیلت اور ایمانی منزلت کو زیر بحث لانے سے قبل خود جناب ہاشم کی ایمانی منزلت اور فضیلت کو بھی دیکھنا ضروری ہے تاکہ مکمل وضاحت ہو سکے۔

عالم اسلام میں شاید ہی کوئی بد نصیب ایسا ہوگا کہ جس کو جناب ہاشم سے تعارف نہ حاصل ہو۔ جناب ہاشم کے والد عبد مناف کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے ہاشم اور عبد الشمس تھے۔ کیونکہ یہ جڑواں پیدا ہوئے تھے اور صورت حال یہ تھی کہ جناب ہاشم کے پاؤں کا پنجہ عبد الشمس کی پیشانی سے چپکا ہوا تھا جس کو تلوار سے کاٹ کر فصل قائم کیا گیا تھا۔ یہ ابتدا ہے اس انتہا کی جس کے لیے حق و باطل کی مثال ہی درست ہو سکتی ہے۔ عاتکہ بنت مرّہ وہ محترمہ تھیں جن کا بطن اس گوہر نایاب کا صدف بنا۔ سب سے چھوٹے بھائی مطلب تھے جو آپ کے ساتھ صلبی و بطنی ربط رکھتے تھے۔

عبد مناف کی اولادوں میں جناب ہاشم کی ہستی وہ ہستی تھی جو اپنے کردار

Presented by www.ziaraat.com

کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئی۔ آپ کے جسم کا ایک ایک تار اسمٰعیلی رشتہ کا مظہر تھا اور اکثر و بیشتر یہ صدائے حق آپ کے کانوں سے ٹکرایا کرتی تھی کہ اے ہاشم! تمھیں مبارک ہو کہ اشرف موجودات کا ظہور تمھاری ہی نسل سے ہوگا۔

برہنہ لوگوں کو لباس عطا کرنا، بھوکوں کو سیر کرنا، تنگ دستوں کی دستگیری کرنا، بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کرنا اور قرض داروں کا بوجھ ہلکا کرنا آپ کا شیوہ تھا۔ جب آپ کوئی دعوت کرتے یا معمولاً دسترخوان بچھاتے تو مہمانوں سے جو بچ جاتا تھا وہ دیگر مخلوق خدا کے لیے ہوتا۔ جناب ہاشم کی اس کرم گستری اور مہمان نوازی کی عکاسی اس دور کے شاعروں نے بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ اگر کبھی مکہ جانے کا موقع فراہم ہو تو ہاشم کے گھر جانا اور جب تو ان کے دروازے پر پہنچے گا تو جود و کرم کے ہاشمی مظاہرات تیری آنکھوں کو خیرہ بنا دیں گے۔ عالی ظرفی کا سمندر تجھ کو اپنی آغوش میں لے لے گا اور تو ہاشمی فضیلت و منزلت کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔

جناب ہاشم کے یہی وہ خد و خال تھے جسے دیکھنے کے لیے قیصر شام و روم اور نجاشی شاہ حبش کی گردنیں بلند تھیں اور یہ لوگ اپنے یہاں عقد کے خواستگار تھے جس کو جناب ہاشم کی عظمت نے پست سمجھا۔

قریش کا دور ارتقا اگرچہ قصی ابن کلاب سے شروع ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ ابتدا تھی۔ اصول ارتقا کے مطابق کسی بھی قوم اور ملک کی تمہید اور تکمیل ایک وقت میں ممکن نہیں ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک بہت سے طوفان دیکھنے پڑتے ہیں۔ جناب قصی کی صلاحیت اور لیاقت کا ہر صاحب نظر معترف ہے۔ انھوں نے اپنی کارگزاری کے دور میں بہت کارآمد تدبیریں سوچیں اور اکثر کو جامۂ عمل پہنانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ساری

تدبیریں اور تجویزیں جناب ہاشم کے ہاتھوں منزل کمال تک پہنچیں۔

حرم (خانۂ کعبہ) کے انتظامی معاملات میں جناب ہاشم کے دادا قصی کے زمانے سے ہی کچھ شکایتیں چلی آ رہی تھیں جو عبدالدار کے دور میں بھی باقی رہیں، بلکہ حالات نے وہ موڑ اختیار کیا کہ جناب ہاشم مداخلت کے لیے مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے بھائیوں کو جمع کر کے اصلاحی امور ان کے سامنے پیش کیے۔

چونکہ جناب ہاشم کی تجاویز میں حرم کی خدمات کا بے لوث جذبہ کارفرما تھا۔ اس لیے کسی نے مخالفت نہ کی اور سب نے بالاتفاق یہ منظور کیا کہ بنی عبدالدار سے حرم کے انتظامات واپس لے لیے جائیں۔ چنانچہ عبدالدار کی اولادوں کو حرم کی خدمتیں واپس کرنے کا پیغام بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے قطعی انکار کر دیا جس کے سبب سے باہمی اختلاف پیدا ہوا۔ یہ اختلاف یقیناً معرکۂ کارزار گرم کر دیتا اگر اس طرح مصالحت نہ ہو جاتی کہ سقایت، رفادت اور دارالندوہ کے خدمات جناب ہاشم کے پاس رہیں اور حجابہ و لواء کے معاملات کا انتظام بنی عبدالدار کریں۔ ان تینوں خدمات کو جناب ہاشم نے جس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ آج تک یادگار ہیں۔

چنانچہ ابن سعد طبقات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تمام قبیلۂ قریش میں جناب ہاشم ایک مرفہ الحال بزرگ تھے۔ جب واردان حرم کی ضیافت اور سقایت ان کے سپرد ہوئی تو آپ نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم اللہ کی جانب سے حرم کے پاسبان و نگہبان ہو اور زمانۂ حج میں جو جماعتیں حاجیوں کا یہاں ہوتا ہے وہ سب تمھارے مہمان ہیں۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ان کی خدمت کا موقع فراہم کیا ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مہمانوں اور زائروں کا احترام کریں اور نہایت سیر چشمی کے ساتھ ان کی

Presented by www.ziaraat.com

ضیافت کے فرائض کو انجام دیں۔ اس تقریر و تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے بڑے پیمانے پر رفادہ کا سامان شروع کیا اور ہر امیر و غریب نے اپنی استطاعت کے مطابق اس خدمت کے لیے جو ممکن ہو سکا وہ نذر کیا۔ جناب ہاشم خود بھی اپنے سرمایہ سے اس مصرف کے لیے مال کثیر نذر کیا کرتے تھے۔ آپ نے حجاج کو آب رسانی کے لیے چمڑے کے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے جو زمزم کے پاس رکھ دیے جاتے اور مکہ کے کنوؤں کے پانی سے لبریز کر دیے جاتے تھے اور دل کھول کر حاجیوں کی ضیافت کی جاتی۔"

ہاشمی فیاضیوں کے یہی وہ غیر فانی نقوش تھے جو عالم کے گوشے گوشے پر ثبت ہو چکے تھے اور تمام لوگ آپ کی ذاتی عظمت اور وجاہت سے اثر پذیر تھے۔ جہاں جہاں سے لوگ آتے وہاں وہاں ان کے وسیع دستر خوانوں، کشادہ دیگوں اور شکم نواز پیالوں کا چرچا ہوتا رہتا اور شکر کے جذبات نظموں اور بلند بانگ خطبوں میں ڈھل کر خاموش فضا میں گونجا کرتے تھے۔

قحط سالی کے دور میں اہل عرب پر جناب ہاشم کے ناقابل فراموش احسانوں کا تذکرہ طبقات کے صفحات میں موجود ہے۔ اور انھیں ہاشم کی نسل بنی ہاشم کہلائی جو ہر اعتبار و ہر زاویے سے اوصاف و صفات ہاشمی کی ورثہ دار تھی۔ چنانچہ بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے بنی کنانہ سے قریش کا انتخاب کیا اور قریش میں بنی ہاشم کو پسند فرمایا۔

قاضی عیاض نے "شفاء" میں لکھا ہے کہ اللہ نے اولاد ابراہیم میں اسمٰعیل کو، اسمٰعیل میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں آنحضرتؐ کو منتخب روزگار قرار دیا۔

تاریخ ابو الفداء میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے جبرئیل امین نے بیان کیا کہ میں نے تمام عالم چھان ڈالا مگر کسی کو خدا کے حبیب سے افضل و بہتر نہ پایا اور زمین کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر کسی باپ کی اولاد بنی ہاشم جیسی نہ ملی۔ الغرض جناب ہاشم اور بنی ہاشم کی فضیلت میں سیکڑوں روایتیں کتابوں میں موجود ہیں جو ان کی حق پرستی اور حق تبلیغی کی مظہر ہیں۔ مگر انھیں نظر انداز کر کے ان بندگانِ خدا پر تہمتِ شرک، ندوی صاحب کا وہ کارنامہ ہے جو ہمارے لیے انتہائی دل آزار اور قابل مذمت ہے۔

حضرت عبد المطلب

حضرت عبد المطلب کے حالات میں فاضل مؤلف نے ایک جملہ تحریر فرمایا ہے جو اہل اسلام کے لیے قابل التفات ہے اور انھیں دعوت فکر دیتا ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابرہہ کے سپاہی عبد المطلب کے دو سو اونٹ بھگا کر لے گئے عبد المطلب اس سے گفت و شنید کے لیے گئے، اس کے دربار میں جانے کی اجازت لی۔ ابرہہ نے ان کی تعظیم کی، اپنے تخت سے اتر کر فرش پر اپنے ساتھ بٹھایا اور پوچھا کہ کیا حاجت ہے جس کے لیے تکلیف کی عبد المطلب نے فرمایا کہ میری حاجت یہ ہے کہ تمہارے آدمی میرے دو سو اونٹ بھگا کر لے آئے ہیں وہ واپس کر دو۔ عبد المطلب کی زبان سے یہ بات سن کر ابرہہ نے حقارت آمیز نظروں سے ان کو دیکھا اور بولا: تم دو سو اونٹوں کے بارے میں بات چیت کرنے آئے ہو اور اس گھر کو فراموش کر رہے ہو جس سے تمہارا اور تمہارے

Presented by www.ziaraat.com

آباء واجداد کا دین وابستہ ہے اور جس کو میں منہدم کرنے آیا ہوں"۔

(المرتضیٰ ص ۳۳-۴۴)

خط کشیدہ عبارت میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا (حضرت عبدالمطلب) کی شان میں گستاخی کی جسارت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مولانا ندوی کی وہابیت پر "رشدیت" کا غبار بھی ہے۔

آپ نے اس انداز سے ابرہہ کا عبدالمطلب کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے کو پیش کیا ہے گویا خود آپ بھی بہ نفس نفیس ابرہہ کے پاس موجود تھے اور اس کی نظروں کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہ کس نظر سے جناب عبدالمطلب؁ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس اہانت آمیز جملے کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ کوئی مورخ ایسا گستاخ تھا کہ وہ رسول اللہ کے جد بزرگوار کے بارے میں اپنی اس مبتذل رائے کا اظہار کرتا۔ بہر حال ان تحقیر آمیز کلمات کے ذمہ دار ندوی صاحب خود ہیں اور جو اصل واقعہ ہے اس کی وضاحت میں کیے دیتا ہوں۔

مورخین نے خانۂ کعبہ پر ابرہہ کے لشکر کشی کے واقعات کو یوں تحریر کیا ہے کہ اہل مکہ کے تجّار کا ایک گروہ بغرض تجارت حبشہ گیا تھا۔ وہاں ان میں سے کچھ لوگ عیسائیوں کی ایک عظیم الشان عبادت گاہ کے قریب قیام پذیر ہوئے اور آگ جلا کر کھانا تیار کیا۔ جب جانے لگے تو آگ بجھا کر جانے کے بجائے یوں ہی چھوڑ گئے، جس سے چنگاری بھڑکی اور اس عبادت گاہ میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ وہاں جو کچھ بھی تھا وہ سب جل کر خاک ہو گیا۔

یہ خبر جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو معلوم ہوئی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے وزیر اعظم ابرہہ بن صباح کو بلا کر یہ حکم دیا کہ تم ابھی مکہ روانہ

ہو جاؤ اور وہاں جا کر اہل مکہ کی عبادت گاہ (خانۂ کعبہ) کو اسی طرح مسمار اور خاک کر دو جس طرح ان لوگوں نے ہماری عبادت گاہ کو تباہ کیا ہے۔ غرض کہ ابرہہ کے ساتھ ایک لاکھ درندہ صفت انسانوں کی فوج جس میں چار سو جنگ جو ہاتھی بھی شامل تھے مکہ کی طرف روانہ ہوئی، اور فوجوں کا یہ سیاہ بادل کوہ و دشت کو عبور کر کے سرزمین بطحا پر وارد ہوا۔ فوج کی کثرت اور ہاتھیوں کا جم غفیر دیکھ کر اہل مکہ گھبرا گئے اور جائے عافیت کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ اس وقت پیغمبر اسلام کے جد بزرگوار اور پاسبان حرم حضرت عبدالمطلب نے انھیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ اطمینان رکھو، اللہ کے گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ وہی اس کا نگہبان ہے اور اس کی طاقت و توانائی کے سامنے تمام دنیا کی طاقتیں ہیچ ہیں۔ اگر تم پہاڑوں پر جانے کے بجائے حرم ہی کو جائے عافیت بنا لو تو تمام آفتوں سے بچ سکتے ہو۔ لیکن حضرت عبدالمطلب کے اس یقین دلانے کے باوجود لوگوں کے اکھڑے ہوئے قدم نہ جم سکے، سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف کلید بردار کعبہ اور آپ کے گھر کے افراد باقی بچے۔ عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کے ماحول کو سنسان دیکھ کر بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ میرے مالک اب تو ہی ہمارا معین و مددگار ہے اور یہ گھر (خانۂ کعبہ) تیرا ہے، تو ہی اس کا محافظ ہے اور میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اپنے جد ابراہیم کا کہ اس کو تمام آفتوں سے محفوظ رکھ۔ حضرت عبدالمطلب کی یہ دعا تمام ہوئی اور پیشانئ قدرت پر ابرہہ اور اس کی فوج کے لیے قہر و غضب کی شکنیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔

اسی درمیان حضرت عبدالمطلب کو یہ خبر ملی کہ ابرہہ کے سپاہی آپ کے دو سو اونٹ زبردستی بھگا لے گئے ہیں۔ آپ نے نہایت پر اعتماد لہجہ میں فرمایا کہ میرے ناقوں میں وہ ناقے بھی شامل ہیں جو اللہ کی امانت ہیں اور زائران حرم

Presented by www.ziaraat.com

کی تواضع کے لیے مخصوص ہیں۔ میں انھیں ابرہہ سے واپس لوں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے دوش پر ردا ڈالی، پٹکا باندھا اور ایک ناقہ پر سوار ہوئے۔ عزیزوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ فرمایا کہ میں اس ظالم سے ملنا چاہتا ہوں جس کے سپاہیوں نے اللہ کے مال پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مال کو واپس لاؤں، یہ سن کر تمام اقارب سدِ راہ ہوئے مگر اس مجسمۂ عزم واستقلال نے کہا کہ مجھے جانے دو، میں انجام سے باخبر ہوں۔ الغرض جناب عبدالمطلبؑ ابرہہ کے لشکر میں اس طرح وارد ہوئے جیسے کوہ سیاہ کے مقابل ماہ تاباں آجائے۔ یا شب تار پر نور سحر چھا جائے۔ مخالفین میں جس کی نظر پڑی وہ مبہوت ودم بخود رہ گیا۔ اتنا پوچھ سکے کہ نور مجسم تم کون ہو؟ عبدالمطلبؑ نے نام بتایا اور کہا کہ ابرہہ بن صباح تک جانا چاہتا ہوں، دربانوں نے ابرہہ کو مطلع کیا۔ ابرہہ نے باریابی کی اجازت دی اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ ہاتھیوں کی فوج بھی بلاکر دورویہ کھڑی کردی گئی۔ یہ ہاتھی بھی مسلح تھے، سر پر آہنی توے، سونڈ میں تلواریں لیے اپنے سواروں کے حکم کے منتظر کہ اشارہ پاتے ہی کچل ڈالیں۔ مگر ہاشم کا نور نظر جب آگے بڑھا تو فوجوں کی صفیں دیکھتی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ جب آپ ہاتھیوں کے اس درّہ کو عبور کر رہے تھے کہ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب ہاتھیوں کے اس جھومتے ہوئے پہاڑ نے عبدالمطلب کے سامنے سر نیاز خم کر کے گھٹنے ٹیک دیے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا کہ خوف زدہ کرنے والے خود ہی خوفزدہ ہو گئے۔ اس سے بنی ہاشم کی جلالت اور دبدبہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے جو خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز نہیں ہوتے وہ بھی باطل کے مقابلے میں انتہائی وزنی ثابت ہوتے ہیں۔

ابرہہ نے بڑھ کر حضرت عبدالمطلبؑ کا استقبال کیا۔ اپنے پہلو میں بٹھا کر

زحمت کشی کا سبب پوچھا۔ عبدالمطلب نے فرمایا کہ کعبہ اور حرم کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے اس لیے کہ وہ اللہ کا گھر ہے، وہ اس کی حفاظت خود کریگا البتہ تمھارے سپاہی میرے دو سو اونٹ لائے ہیں اگر چاہو تو انھیں واپس کردو۔ فوراً ابرہہ نے حکم دیا اور وہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد ابرہہ نے پھر پوچھا کہ اور کچھ مانگنا ہو تو مانگو، یہ گویا شکست کا مظاہرہ تھا۔ یقین کیجیے کہ ایسے موقع پر اگر عبدالمطلب کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ خانۂ کعبہ کے لیے کچھ کہہ جاتا۔ مگر حضرت عبدالمطلب اپنے یقین کامل کے آئینہ میں حرم کا درخشاں مستقبل دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ یہ جھگڑا باقی رہے، اور آج ہی ایسی فیصلہ کن جنگ ہو جائے جو جارحانہ اقدام کے تصور کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کردے۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ دشمن کے استقلال میں خود ایک تزلزل پیدا ہو چکا تھا اور اس کو اپنی فتح مشکوک نظر آرہی تھی۔ چنانچہ جب دوبارہ عبدالمطلبؑ نے فرمایا کہ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا تو ابرہہ نے کہا کہ حرم کے لیے مجھ سے کیوں نہیں کہتے؟ مگر عبدالمطلبؑ نے جواب میں وہی کہا کہ اس کا ایک کارساز ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے؟

حضرت عبدالمطلبؑ کا یہ جواب دراصل دشمن کے تقاضہ کا جواب نہیں تھا بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ آپ نے وجود خدا اور اس کی وحدانیت کی پیامبری کی تھی۔ آخر میں ابرہہ نے کہا کہ کہو تو تمھارے شہر سے واپس چلا جاؤں۔

ہاشم کی یادگار کارساز کعبہ کا محرم راز تھا، تقدیر کعبہ سے اس کے ضمیر کی آواز بھلا کیونکر متصادم ہو سکتی تھی۔ وہ اگر کہہ دیتا تو ابرہہ ضرور واپس چلا جاتا لیکن اہل مکہ کو اہل حبشہ کے بار احسان سے دبنا پڑتا اور کعبہ کی

Presented by www.ziaraat.com

عظمت زیرِ نقاب رہ جاتی۔ خلیل اللہ کی تعمیر اور ذبیح اللہ کی محنتیں دنیا کی دیگر تعمیرات کی ہم پلّہ ہو کر رہ جاتیں اور اللہ کی قدرت و توانائی موضوعِ بحث بن جاتی۔ لہٰذا حضرت عبدالمطلبؑ یہ کہہ کر واپس آگئے کہ خانۂ کعبہ کے خلاف جو کچھ تمہارے دل میں ہے اسے کر کے اپنا انجام خود دیکھ لو۔

حضرت عبدالمطلب خود تو چلے آئے مگر دبدبۂ ہاشمی کے غیر فانی نقوش قلبِ دشمن پر چھوڑ آئے، جس کے اثرات ابرہہ کے اس اعتراف کی شکل میں ظاہر ہوئے کہ جب اس نے کہا کہ اس شخص کی زبردست ہیبت میرے دل میں سما گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمراہیوں سے مشورہ لیا کہ تم لوگ بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ لوگوں نے تباہی و بربادی کا مشورہ دیا اور کہا کہ مکہ کو لوٹ لیں اور حرم کی ایک ایک اینٹ کھود کر جدّہ کے سمندر میں پھینک دیں۔ چنانچہ ابرہہ مع لشکر اپنے تخریبی اقدام کو جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے چلا، اُدھر حضرت عبدالمطلب نے مکّہ خالی کر دیا اور کوہ ابو قبیس پر اس لیے چلے گئے کہ مشیت الٰہی کو اپنا حکم نافذ کرنے میں تردد نہ ہو، جس طرح انبیائے سابقین نے الٰہی قہر و غضب کا نشانہ بننے والی بستیوں کو چھوڑا تھا اسی طرح آپ نے مکہ کو خالی کر دیا اللہ سے نصرت کا طلبگار اِدھر پہاڑ پر پہنچا اُدھر حیوانیت کے بل پر مقابلہ کرنے والی جماعت حرم کی طرف بڑھی، مرضیٔ قدرت نے چاہا کہ ایک بار پھر غافلوں کو چونکا کر اتمام حجت کر لی جائے۔ چنانچہ حرم تک پہنچتے پہنچتے وہ کوہ پیکر ہاتھی جو گویا لشکر کے علم کی جگہ تھا، یکبارگی رُک گیا۔ ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں لیکن وہ اس وقت تک آگے نہ بڑھا جب تک اس کا رخ خانۂ کعبہ سے دوسری طرف موڑا نہیں گیا۔ لیکن اس کے باوجود دشمنوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ اپنے ارادے پر قائم رہے البتہ اس درمیان ابرہہ نے مصالحت کی ایک بار پھر ناکام

کوشش کی اور ایک مخصوص قاصد عبدالمطلبؑ کی خدمت میں بھیج کر یہ کہلایا کہ ہم اب واپس جانے کو تیار ہیں۔ اگر اہل مکہ ہرجانہ ادا کر دیں اور ہماری اس عبادت گاہ کا تاوان ادا کر دیں جو اُن کی بدولت جل کر خاک ہو چکی ہے۔ جواب میں حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ بے گناہ افراد خطا کار کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ رہا حرم کا مسئلہ تو اس کے لیے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا ایک محافظ ہے وہ خود ہی اس کی حفاظت کرے گا تم اپنے سردار سے کہدو کہ وہ حملہ کرے یا واپس جائے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔

جناب عبدالمطلبؑ کا جب یہ جواب استغنا پہنچا تو ابرہہ نے مایوس ہو کر کہا کہ اب مصالحت کی گنجائش نہیں ہے، حملہ کرو۔ اس کے بعد وہ طوفانی فوج حرم کی طرف بڑھی۔ قہر الٰہی کو حرکت ہوئی اور اللہ کی ایک مخلوق نے (جو ابابیل کے نام سے موسوم ہے)، آسمان سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا کر ابرہہ کے سارے لشکر کو آن واحد میں جگالی کیا ہوا بھوسہ بنا دیا۔ نہ ابرہہ بچا، نہ اس کی فوج، عبدالمطلبؑ کو یقین محکم کے صلے میں اللہ نے فتح و ظفر سے ہمکنار کر دیا۔

اس واقعہ میں قہر الٰہی کی شانِ نزول بھی عجیب تھی۔ دستور قدیم کے مطابق نہ زمین شق ہوئی، نہ آگ برسی، نہ تیز و تند ہواؤں کا طوفان آیا، نہ انسانوں کو مسخ کیا گیا اور نہ تختہ پلٹا گیا۔ کیونکہ یہ وہ مقام تھا جو طوفان نوحؑ کے ہمہ گیر قہر کے موقع پر بھی عذاب کے پانی سے محفوظ رہا۔

چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعہ ننھی ننھی کنکریاں مرکزِ ظلم پر یوں برسائی گئیں کہ نہ حرم کو کوئی صدمہ پہنچا نہ سرزمین حرم کی بے حرمتی ہوئی، نہ کوئی بے قصور ہلاک ہوا اور نہ کوئی قصوروار بچ سکا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ مولانا ندوی کا یہ کہنا کہ ابرہہ

Presented by www.ziaraat.com

نے عبد المطلبؑ کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد کی صریحاً توہین اور ہم اہل اسلام کے لیے انتہائی دل آزار، قابل اعتراض اور قابل مذمت جملہ ہے۔

حضرت ابو طالب علیہ السلام

مولانا ابو الحسن صاحب ندوی جناب ابو طالبؑ کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا"۔ (المرتضیٰ ص ۳۹ سطر ۶)

اس کے بعد ندوی صاحب نے محض اسی جملے پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہ حاشیہ پر اپنے نوٹ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ بات کتب حدیث، سیرت قدیم وجدید سے ثابت اور مشہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا، لیکن یہ بات اس کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ دین اصول وعقیدہ کا مذہب ہے۔ نہ کسی فرد کی طرفداری کرتا ہے اور نہ کسی خاندان کی۔ بنیاد صرف وہ ہے جس کی دعوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ شخصی محبت اور تنہا دافعت وحمایت بھی کام نہیں آتی اگر اس کے ساتھ صحیح عقیدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان نہ ہو"۔

(المرتضیٰ ص ۳۹)

امتداد زمانہ کے زیر اثر مختلف ادوار میں، بخاری کی ایک مرسل روایت کی بنا پر (جس میں مسیب شامل ہے) کچھ ایمان فروش حضرت ابو طالبؑ کے ایمان واسلام پر اپنی گندی اور ناسور زدہ ذہنیت کا کیچڑ اچھالتے آئے ہیں جن کی

تقلید مولانا ندوی نے بھی المرتضیٰ میں کی ہے۔ حالانکہ اصول اور انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کا کفر ثابت نہ ہو، اس وقت تک اس کے ایمان یا اسلام کو چیلنج کرنا محض جہالت اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔

مولانا ندوی کی بات بھی دیگر معترضین کی سابقہ گفتگو کی طرح اس لیے بے وزن اور ناقابل التفات ہے کہ وہ حضرت ابو طالبؑ پر تاریخ اور دلائل کی روشنی میں کفر کا فتویٰ صادر فرمانے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا صرف یہ کہہ دینا کہ "ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا" یا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا" اور اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں کوئی کتابی حوالہ نہ پیش کرنا، حضرت ابو طالب کی بلند پایہ ذات والاصفات کو سبک کر کے عالم اسلام کے سامنے پیش کرنے کی سعئ ناکام کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ مولانا ندوی اس مہمل گفتگو کے جواب میں جناب ابو طالب کی حیات طاہرہ کے ان لمحات کی ایک جھلک ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائے جو آپ کے ایمان واسلام سے وابستہ ہیں۔ اس جھلک کی ابتدا میں اپنے ہی ایک شعر سے کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

سراپا وہ ایمانِ کامل تھا جس نے رسالت کو پالا امامت کو ڈھالا
نبی کے چچا کے مقابل وہ آئے جو اپنے کو کہتا ہو ایمان والا (مولف)

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتۂ حیات میں آٹھ گرہیں پڑ چکی تھیں کہ مشیت الٰہی کو منظور ہوا کہ حضرت عبد المطلب کو ان کے بار سے ہلکا کیا جائے اور جناب ابو طالبؑ کو یہ خدمت سپرد کی جائے جس کی تمنا انھوں نے اس وقت ظاہر کی تھی جب عبد اللہ کی قربانی کا مسئلہ درپیش تھا۔ حضرت عبد المطلب علیل ہوئے اور جب علالت میں شدت ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ بیت الحرام کے نزدیک لے چلیں اور کعبہ کے پردوں سے متصل رکھ دیں۔ تعمیل کی گئی اور آپ کی اولادیں

Presented by www.ziaraat.com

آپ کے چاروں طرف بیٹھ گئیں۔ ان کے علاوہ روسائے قریش اور شیوخ قبائل بھی سب موجود تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔ اس کرب و اضطراب کے ماحول میں حضرت عبدالمطلبؑ نے کروٹ لی اور قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم سب پر میرا حق نہیں ہے؟ سب نے بیک آواز ہو کر کہا۔ ہم میں ہر خورد و کلاں پر آپ کا حق ہے اور آپ ہمارے بہترین قائد ہیں۔ اس اقرار کے بعد حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ میں محمدؐ بن عبداللہؑ کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اس امر کی تاکید کرتا ہوں کہ ان کی تعظیم واکرام کرنا اور ان پر ظلم وجور نہ کرنا۔ اس کے بعد آپ نے جناب ابوطالب کی طرف کروٹ لی اور کچھ اشعار مرحمت فرمائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "ابوطالب میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اپنے قرۃ العین محمدؐ کو تمھارے سپرد کرتا ہوں تم اس کا خیال رکھنا اور اپنی آخری سانس تک اس کی تعظیم و متابعت کرنا اور اس کے دشمنوں سے خبر دار رہنا۔

اس نادر روزگار امانت کے لیے امانت دار کی تشخیص میں صرف صلبی وبطنی یگانگت کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مشورۂ الٰہی کو بھی مقدم سمجھا گیا۔ چنانچہ زرقانی مواہب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "عبدالمطلبؑ نے اولادوں کے درمیان قرعہ اندازی بھی کی اور قرعہ ابوطالب کے نام نکلا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ ایسے کو اپنی امانت سپرد کرے جو اس کا منکر اور اس کے قانون کا مخالف ہو"۔

ہاشم کے گھرانے کی یہ خصوصیت ہے کہ خلف کا طریقِ کار سلف کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہاں قول وعمل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہوتا۔ برسوں باپ کا انداز تربیت قبول کرنے کے بعد یہ کیونکر ممکن تھا کہ جناب ابوطالب اپنے دور میں باپ کی تربیت کو فراموش کر دیتے۔ رسالت کے تحفظ کی ذمہ داری اور

فرائض کے احساس نے چچا کو رسولؐ کے باپ کا درجہ دیا اور چچی فاطمہ بنت اسد نے ماں کی جگہ لی اور ایسی شفقت و محبت سے پیغمبر اسلام کی پرورش فرمائی کہ والدین کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔

حضرت ابوطالبؑ کی شادی آپ کی حقیقی چچا زاد بہن فاطمہ بنت اسد سے ہوئی تھی جو ابتدائے عمر سے ہی ملت ابراہیمی اور دین فطرت پر گامزن تھیں لیکن ان تفصیلات کے ساتھ کہ جو حضور سرور کائنات اپنے ساتھ لائے تھے آپ نے سنہ بعثت میں جناب خدیجۃ الکبریٰ کے ہمراہ اسلام قبول فرمایا تھا اور آپ کا شمار اسلام قبول کرنے والی خواتین کی صف اول میں ہوتا ہے۔ سنہ ھ میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اس طرح مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد مکمل دس سال تک حضرت ابوطالبؑ کے ساتھ رہیں اور اس وقفہ میں دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چچی کو اختلاف عقائد کی بنیاد پر ابوطالب سے علاحدہ ہونے کا مشورہ دیا نہ کوئی مواخذہ کیا جیسا کہ تفسیر کبیر، فخرالدین رازی جلد ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۴ ص ۳۴۹ سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت عمر کی زوجہ محترمہ ام کلثوم بنت عقبہ بن معیط کے پاس سے بھاگ کر آئیں اور انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے رشتہ داروں نے پیغمبر اسلام صلعم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن پیغمبر نے یہ کہہ کر ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی عورت کافر کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی۔ لہذا اس ارشاد پیغمبرؐ کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ فاطمہ بنت اسد کی طرح حضرت ابوطالبؑ بھی راہِ حق پر اپنی آخری سانس تک گامزن رہے اور اپنے ایمان واسلام کی تابندگی کے ساتھ سنہ ۱۰ بعثت میں جوار رحمت سے ہمکنار ہو گئے اور آپکے انتقال کے سال کو

Presented by www.ziaraat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "عام الحزن" کے نام سے موسوم کر دیا۔ حضرت ابو طالبؑ نے اپنی حیات کے آخری دور میں کچھ اشعار کہے تھے جن میں یہ دو شعر قابل توجہ ہیں:

دعوتنی وعلمت انک صادق — ولقد صدقت فکنت قبل امینا

ولقد علمت بان دین محمدؐ — من خیر ادیان البریۃ دینا

ترجمہ:۔ اے محمدؐ تم نے مجھے اسلام کی طرف دعوت دی اور میں خوب جانتا ہوں کہ تم صادق اور سچے ہو اور تم اس عہدۂ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی لوگوں کی نظر میں صادق اور سچے تھے، میں خوب جانتا ہوں کہ تمھارا دین تمام ادیان عالم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہ بنت اسد سے عقد کے موقع پر جناب ابو طالب نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی آپ کے ایمان کا مظہر اور تاریخ کے خزانے میں گوہر نایاب کی طرح محفوظ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کے لیے تمام خوبیاں مخصوص ہیں جو رب العالمین اور کائنات کی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے اور جس نے ہم کو سید و سردار کی حیثیت سے منتخب کر کے عارفین و مخلصین میں شمار کیا۔ تمام عیوب سے پاک رکھا اور ہمیں تمام قبائلِ عرب پر فضیلت دے کر ان کا پیشرو بنایا ہم خلاصۂ نسل ابراہیمی، جوہر صفات خلیلی اور حضرت اسماعیل کی کشتِ بارآور ہیں۔ ہم نے فاطمہ بنت اسد سے شادی کی اور ان کا مہر شرعی ادا کر کے امر تزویج نافذ کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے متواتر سات دن تک دعوت ولیمہ کا اہتمام کر کے تمام قبائل عرب کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا۔ اس کا تذکرہ امیہ بن صلت نے اپنے اشعار میں کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو طالب نے اپنی شادی کے ولیمہ سے ہمیں ڈھانپ لیا ہے اور نہایت خلق و محبت کے مظاہرات اس

شادی میں سامنے آئے ہیں۔

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار اور آفتاب کی طرح روشن ہے کہ جب جناب خدیجہ نے پیغمبر اسلام سے شادی کی خواہش کی اور نسبت طے ہو گئی تو رسول اللہ صلعم کی جانب سے جو خطبۂ نکاح جناب ابو طالبؑ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوا اس کی ابتدا ان لفظوں سے تھی:۔ "الحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم" تمام تعریفیں اس خدا کی ہیں جس نے ہمیں ذریت ابراہیم میں قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ شکر ہے اس پروردگار کا جس نے ہمیں فضیلت عطا کی۔ یہ میرا بھتیجا محمدؐ میرے بھائی عبد اللہ کی یادگار اور فضل و شرف میں لاثانی ہے۔ پچیس اونٹوں اور چار سو دینار سرخ پر عقد ہوا۔ مہر کی رقم حضرت ابو طالبؑ نے اسی وقت ادا کر دی۔ (تاریخ اسلام ج۲ ص ۸۷، تلخیص سیرۃ النبی ص۹۹ الیعقوبی ج۲ ص ۱۶ وغیرہ)

ڈپٹی نذیر احمد کا کہنا ہے کہ آپ عبد المطلب کی اولادوں میں سب سے زیادہ باوقار اور عقلمند تھے۔ عبد المطلب کے بعد آپ نے پیغمبرؐ اسلام کی پرورش کی اور تا حیات ان کی نصرت و حمایت کرتے رہے۔ مولوی شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ ابو طالبؑ کا طریقہ تا زیست رہا کہ آنحضرتؐ کو اپنے ساتھ سلاتے تھے اور جہاں جہاں جاتے ساتھ لے جاتے۔ کفار قریش اور اشرار یہود سے آپ نے آنحضرتؐ کی حفاظت کی، اور انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچنے دیا۔ علامہ طریحی کا بحوالۂ امام جعفر صادق علیہ السلام کہنا ہے کہ ابو طالبؑ ایمان کے تحفظ میں اصحاب کہف کے مانند ہیں۔ شمس العلماء نذیر احمد فرماتے ہیں کہ ابو طالبؑ دل سے پیغمبر کو اللہ کا رسول اور اسلام کو خدا کا سچا دین سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرتے وقت بھی جناب ابو طالب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ (ماخوذ از چودہ ستارے ص ۴۰-۱۴۱)

Presented by www.ziaraat.com

حضرت ابوطالب علیہ السلام کا ادبی کمال بھی نقطۂ عروج پر تھا جس کے ثبوت میں آپ کے اشعار موجود ہیں جن سے اسلام کی تبلیغ اور رسالت کی تائید کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے بھائی حمزہؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے موقع پر فرماتے ہیں کہ اے بھائی آپ اللہ کے دین اور محمد کی متابعت میں ثابت قدم رہیں اور استقلال کے ساتھ اظہار اسلام کرتے رہیں۔ خدا آپ کو عزم و ثبات کی توفیق عطا کرے۔

اسی طرح حضرت ابوطالب کے وہ بے شمار اشعار جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، اپنے دامن میں ایمان و اسلام کی دولت لیے آج بھی صفحۂ قرطاس پر موجود ہیں۔ چونکہ یہ اشعار عربی زبان میں ہیں اس لیے طوالت کے خیال سے انھیں ترک کر کے ان کے مفہوم پر مبنی چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) جب کفار مکہ نے حضرت ابوطالب سے شکایت کی کہ آپ اپنے بھتیجے محمدؐ کو اس بات سے روکیں کہ وہ ہمارے خداؤں اور ہمارے دین کو برا بھلا کہتے ہیں تو آپ نے رسول سے فرمایا کہ بیٹا تم تبلیغ حق کو جاری رکھو، بخدا جب تک میں زندہ ہوں کفار تم تک نہیں پہنچ سکتے اور جب تک میرے بازوؤں میں قوت ہے یہ لوگ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

(۲) جب کفار کے عہد نامہ کو دیمک دفتر بے معنی کی طرح چاٹ گئی تو حضرت ابوطالبؑ نے قریش کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ بس اس میں اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے منکرین کو یقین نہ آیا تو آپ نے ان کے ظلم و ضد کو اپنے اشعار میں نظم کیا جن میں سے بعض کا مفہوم یہ ہے کہ عہد نامہ کی سرگزشت مقام عبرت ہے۔ جب بے خبر کو اس کی خبر دی جاتی ہے تو وہ آئینۂ حیرت ہو جاتا ہے۔ اس عہد نامہ میں جو

کفر و عناد کی باتیں تھیں ان کو اللہ نے محو کر دیا اور ایک مجسمہ صداقت (رسول اللہ صلعم) کے خلاف جو زہر اگلا گیا تھا وہ نقش بر آب ہو کر رہ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مخالفین کی تمام باتیں باطل ثابت ہوئیں۔

(۳) ایک موقع پر آپ نے حضور کو اپنے اشعار کے ذریعہ کار تبلیغ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے بیٹا اپنا کام کرتے رہو اور نہایت اطمینان سے دعوت حق میں سرگرم رہو کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے کفار مکہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

(۴) ایک موقع پر آپ نے کچھ اشعار پڑھے، درمیان میں رسولؐ کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ بے شک تم اللہ کے رسول ہو اور نورانی صورت والے بلند مرتبہ سردار ہو۔ تم بھی پاک و پاکیزہ ہو اور تمھارے ماں باپ بھی پاک اور عالی نسب ہیں۔

(۵) جب عثمان بن مظعون کو شاہراہ حق اختیار کرنے پر کفار نے اذیتیں دیں اور انھیں مضروب کیا تو آپ کے حق نواز جذبات برانگیختہ ہوئے اور آپ نے اپنے اشعار میں فرمایا کہ کیا تم اس بے وفا زمانے کے ناروا سلوک پر گرفتہ خاطر ہو اور حزن و ملال کو دل میں جگہ دیتے ہو۔ یہ تو اس کی طینت ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے اخلاق کا تو یہ عالم ہے کہ وہ فواحش کو ہنر سمجھتا ہے اور حیلہ سازی کو کمال انسانیت جانتا ہے۔ خدا ظالموں کو ذلیل کرے۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو بہت جلد اس کا انتقام لوں گا اور یہ پیمانہ اسی طرح لبریز ہو گا جیسے ان کا پیمانۂ ظلم۔ میرے اقدامات اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک کفار اپنے کرتوت سے باز نہ آجائیں اور سر مذلت خم نہ کر دیں، ان کے ظالمانہ اقداموں کا جواب دینے کے لیے میرے پاس صاعقہ بار تلوار موجود

Presented by www.ziaraat.com

ہے جو دماغی امراض کو دور کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ میری طرف سے یہ شمشیر زنی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ بد دماغ لوگ اپنے دماغوں کی اصلاح نہ کریں گے یا اس کتاب خدا پر ایمان نہ لائیں گے جو رسول کے لیے ہے اور جس کی حقانیت و صداقت کے محکم شواہد موجود ہیں۔

(۶) جناب ابو طالب علیہ السلام کا ایک لامیہ قصیدہ بہت مشہور رہے جو سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے بعض اشعار کا تذکرہ علامہ ابن ابی الحدید نے بھی شرح نہج البلاغہ میں کیا ہے اور علامہ دجلانی نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ ابو طالب کے ایمان پر یقین کی واضح دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن کثیر نے اس کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ قصیدہ بے حد بلیغ ہے اور کوئی اس کی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ قصیدہ معلقات سبعہ سے بہتر و بلند تر ہے۔ اس کے بعض اشعار کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کفار مکہ کی دلی تمنا ہے کہ ہم ترک وطن کریں۔ اے کافرو! یہ آرزو بے بنیاد اور غلط ہے۔ حرم کی قسم ہم بغیر محمدؐ کی مرضی کے کبھی اس سرزمین سے جدا نہ ہوں گے۔ تم ہمیشہ یوں ہی جلتے اور کڑھتے رہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم محمدؐ کو بغیر مقابلہ کے تمھارے حوالے کر دیں گے۔ یاد رکھو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے بچے اور خواتین تک محمدؐ پر قربان ہو جائیں۔ سمجھ لو اگر تمھاری یہی روش رہی تو تمھاری گردنیں ہوں گی اور ہماری تلواریں۔ تم لوگوں کی حالت سخت قابل تعجب ہے کہ تم اس کے دامن کو چھوڑ رہے ہو جس کے وسیلے سے بارش کی دعا کی جاتی ہے جو رحمت للعلمین، حق کا طرفدار، یتیموں کا والی اور بیواؤں کا سرپرست ہے۔ وہ ہماری روح و جان ہے اور ہم وہ ہیں کہ کبھی کسی کا خون بہا ہم کو دینا نہیں پڑا اور نہ ہم نے کسی بے گناہ و بے خطا کو قتل کیا۔ نہ ہم مصیبت

میں ذلیل لوگوں کے حلیف ہوئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں محمدؐ کا سچا جاں نثار ہوں اور انھیں اللہ کا سچا رسول مانتا ہوں۔ خدا نے ان کو دنیا کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ کوئی ان کا مثل نہیں ہے۔ ان کا ولی ایسا معبود ہے جو ان سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہتا۔ وہ ایسا ممتاز ہے کہ ہر بلندی اس کے آگے پست ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہم نے اپنے سینوں کو سپر بنا لیا ہے۔ خدا اس کو اپنی حمایت و حفاظت میں رکھے اور اس کے نہ مٹنے والے دین کو دنیا پر غالب کر دے۔

(۷) مورخ ابو الفداء نے جناب ابو طالبؑ کی ایک مسلسل نظم کو جلد اول میں تحریر کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ نظم حضرت ابو طالبؑ کی طرف سے تصدیق رسالت پر کامل دلیل ہے۔ جس کے کچھ اشعار کا ترجمہ یوں ہے کہ:۔

بخدا کفار قریش اپنی جماعت سمیت تم تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں زمین میں دفن نہ ہو جاؤں، اے محمدؐ! تم کو جو خدا کا حکم ہے اس کا بے خوف اعلان کرو۔ اے محمدؐ تم نے مجھ کو اللہ کی طرف دعوت دی ہے اور مجھے تمھاری صداقت و امانت کا محکم یقین ہے اور تمھارا دین تمام مذاہب عالم سے بہتر اور ان کے مقابلہ میں کامل تر ہے۔

(۸) حضرت ابو طالبؑ نے اپنے خاندانی وقار اور رفعت کا تذکرہ بھی اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کے اشعار موجود ہیں۔ علامہ دجلانی نے اس نظم کو ابو طالب کی شاعری کا شاہکار قرار دیا ہے۔ یہ نظم بھی تصدیق نبوت کی دلیل میں ہے۔ جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اشراف قریش اگر کسی موقع پر فخر و مباہات سے بزم آرائی کریں تو عبد مناف ان میں جوہر بے عیب ثابت ہوں گے، اور جب عبد مناف کی نسل میں شرافت و نجابت کا چرچا

Presented by www.ziaraat.com

ہو گا تو ہاشم اور بنی ہاشم کو فضیلت حاصل رہے گی اور بنی ہاشم اگر فخر و ناز کریں تو محمد مصطفیٰؐ کی ذات اقدس مخزن شرف ثابت ہو گی اور یہ وہ ہیں جنھیں اللہ نے نبوت عطا کی ہے۔

(۹) حضرت ابو طالبؑ نے ابو لہب کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے سلسلے میں اپنی ایک نظم میں ہدایت فرماتے ہوئے کہا کہ اے ابو لہب! ایسا کام نہ کرو کہ جس سے زندگی بھر تمھیں عرب کے میلوں اور محفلوں میں گالیوں سے نوازا جائے۔ رسول کی مدد و نصرت میں زندگی گذارو کیونکہ تم بے دست و پا اور عاجز و مجبور نہیں پیدا کیے گئے۔ اس نظم کو بھی ابن ہشام نے اپنی سیرت میں درج کیا ہے۔

(۱۰) ابن ہشام کی سیرت میں حضرت ابو طالبؑ کی ایک نمایاں اور معرکۃ الآرا نظم اور بھی ملتی ہے جو حضرت علی علیہ السلام اور حضرت جعفر طیارؑ سے متعلق ہے اس نظم میں بھی آپ نے ترغیب نصرت کا نشان بلند کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جناب ابو طالبؑ نے رسول اللہؐ کو دیر تک نہ دیکھا تو بے چین ہوئے اور آپ کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں کفار نے گرفتار نہ کر لیا ہو۔ آپ فوراً اپنے فرزند جعفرؑ کو لے کر تلاش میں نکلے دیکھا کہ مکہ کی ایک گھاٹی میں رسولؐ اور علیؑ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو طالبؑ نے جعفرؑ سے کہا کہ آگے بڑھو اور اپنے بھائی کے ساتھ بازو جوڑ کر اس کا ساتھ دو۔ جناب جعفر طیارؑ نے حکم کی تعمیل کی اور مصروف نماز ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر فرطِ مسرّت سے ابو طالب کی آنکھیں چھلک پڑیں اور آپ نے کچھ اشعار فرمائے جن کا مفہوم یہ ہے کہ اے علیؑ و جعفرؑ دیکھو تم لوگ کبھی دین حق سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے بھائی محمدؐ کو کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔ میں محمدؐ کے دین کی تائید کرتا ہوں، بخدا نہ میں اس سے دستبردار

ہوں گا اور نہ میری نجیب الطرفین اولادیں اس کی نصرت سے دریغ کریں گی۔ اس نظم کو ابن ابی الحدید نے بھی شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔

(۱۱) حضرت ابو طالبؑ کی ایک نظم تنزیل وحی سے متعلق بھی ہے۔ اسے بھی ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔ ابو طالب فرماتے ہیں کہ محمدؐ وہ نبی ہیں جن پر رب العالمین کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے جو اُن کی رسالت کو تسلیم کرے گا اس کو حشر میں شرمندہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی۔ محمدؐ خدا کی قسم محبوب خدا ہیں، امین شریعت ہیں مہر نبوت من جانب اللہ ان پر ثبت ہے۔ اس کے بعد آپ کفار قریش کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خبردار رسولؐ کے معاملہ میں احمق نہ بنو، اور منحوسوں، گمراہوں کا اتباع نہ کرو۔

(۱۲) حضرت ابو طالب علیہ السلام کا ایک قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی ہے جو ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے محمدؐ کو مکرم بنایا اور اپنی تمام مخلوقات پر انھیں مشرف کیا، اے پروردگار! تو گواہ رہنا کہ میں دین محمدؐ پر ہوں اور ہدایت یافتہ ہوں۔ جس کو گمراہی پسند ہو وہ گمراہ ہے۔

ان نظموں کے علاوہ حضرت ابو طالبؑ کے اور بھی اشعار ہیں جو ایسے ہی پاکیزہ مقاصد اور بلند تر تعلیم پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت ابو طالب کے ایمان و اسلام پر بھرپور تبصرہ کیا جائے۔ اس امر کے لیے الگ سے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ بہرحال مذکورہ قصائد پر اگر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو حضرت ابو طالب کا اسلامی کردار اور عقیدہ آفتاب کی طرح روشن و منور نظر آتا ہے اور ہر انصاف پسند انسان ابو طالبؑ کے ان اشعار کی روشنی میں آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آپ صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ آپ نے بعض مواقع

Presented by www.ziaraat.com

پرکار رسالت اور کار تبلیغ کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کو حوصلہ دے کر نبوت کی رہبری بھی فرمائی ہے۔ میرے نزدیک مولانا ندوی کا یہ دعویٰ کہ ابو طالبؑ نے اسلام قبول نہیں کیا بالکل غلط بے بنیاد اور باطل ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ندوی صاحب حضرت ابو طالبؑ کے ایمان و اسلام کے پرکھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنے ایمان و اسلام کا محاسبہ کرتے کہ وہ کیا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت کیوں پیش کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ خلفائے ثلاثہ کے والدین کافر تھے اس لیے حضرت علی علیہ السلام کی عداوت میں ان کے والد بزرگوار کی فضیلت پر بھی ضرب لگائی گئی۔ ورنہ حقیقت سے اس روایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مومن قریش حضرت ابو طالبؑ اور جناب خدیجۃ الکبریٰ کی قبریں مکہ کے قبرستان حجون میں ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ ان قبروں پر پہلے کوئی گنبد نہیں تھا۔ مورخ ذاکر حسین کا کہنا ہے کہ مرزا اصغر علی فصیح لکھنوی نے تیرھویں صدی کے وسط میں مومنین کی مدد سے ان پر گنبد تیار کرایا تھا۔

جناب طالب علیہ السلام

جناب ابو طالبؑ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے حقیقی بھائی کا نام طالب ہے جو امیر المومنینؑ سے تیس سال عمر میں بڑے تھے، انھیں کے نام سے حضرت ابو طالبؑ کی کنیت وابستہ ہے۔

جناب طالب کے متعلق مولانا ندوی فرماتے ہیں:۔

"طالب کی غزوۂ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی"

(المرتضیٰ ص ۴۰)

افسوس ہے کہ عام کتابوں میں جناب طالب کے حالات نہیں ملتے۔ علامہ ابن قتیبہ دینوری نے لکھا ہے کہ جناب ابو طالبؑ کے چار بیٹے ہوئے۔ طالب، عقیل، جعفر اور حضرت علیؑ۔ اور ہر بھائی دوسرے سے دس برس چھوٹا تھا۔ ان سب نے اولادیں چھوڑیں سوائے طالب کے کہ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ (معارف ص ۳۹) اور عمدۃ المطالب ص ۱۵ میں ہے کہ جناب ابو طالبؑ کے چار بیٹے ہوئے اور ہر بھائی دوسرے بھائی سے دس سال چھوٹا تھا گویا جناب طالب جناب امیر سے تیس سال بڑے تھے۔ انھیں کی وجہ سے آپ کے باپ کی کنیت ابو طالب تھی۔ اور ان چاروں فرزندوں کی مادر گرامی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جن کے بطن سے ہاشمی فرزند پیدا ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت علیؑ کی ہجرت کے بعد جناب طالب کا قیام مکہ ہی میں رہا یہاں تک کہ جب غزوۂ بدر واقع ہوا تو کفار قریش نے انھیں بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ روانہ ہوئے مگر راستہ ہی سے غائب ہو گئے۔ کیونکہ وہ اسلام کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے سمندر کی طرف چلے گئے اور پھر پلٹ کر نہ آئے۔ بعض مورخین کی تحریروں سے اس امر کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہونے کی پاداش میں کفار مکہ نے انھیں سمندر میں غرق کر کے ختم کر دیا۔

علامہ دیار بکری نے لکھا ہے کہ طالب غزوۂ بدر میں کام آئے جب مکہ کے مشرکین نے آپ پر ظلم و جبر اور تشدد کر کے آپ کو جنگ میں شامل کیا۔

(تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۸۴)

علامہ مسعودی نے تحریر کیا ہے کہ کفار قریش نے طالب بن ابو طالبؑ کو

Presented by www.ziaraat.com

غزوۂ بدر میں مجبور کر کے لڑنے کو بھیجا۔ چنانچہ وہ گئے مگر پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی البتہ ان کا یہ کلام اب تک محفوظ ہے۔

یارب اما خرجوا بطالب   فی مقنب من تلک المقانب
فاجعلهم المغلوب غیر الغالب   والرجل المسلوب غیر السالب

اے پروردگار اگر یہ لوگ طالب کو زبردستی اپنی فوج کے ساتھ لے جاتے ہیں تو ان کو شکست دے اور انھیں اس درجہ کمزور کر دے کہ یہ خوب لوٹے جائیں اور یہ خود کسی کو لوٹ نہ سکیں۔ (مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۷۶)

جناب طالب کی یہ دعا قبول ہوئی اور غزوۂ بدر میں کفار کو شکست ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب طالب بھی دل سے ایمان رکھتے تھے لیکن کفار قریش کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ اسی کا نام تقیہ ہے۔

مولود کعبہ حضرت علی علیہ السلام

اس ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحیح روایتوں کے بموجب سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش عام الفیل کے ۳۰ھ میں (چھٹی صدی عیسوی) رجب کی بارہ راتوں کے گزرنے کے بعد ہوئی۔ حاکم نے حکیم ابن حزام کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور حکیم ابن حزام بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے:۔ سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے

کہ کہاں ہوئی تھی۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ ان کی پیدائش اندرون کعبہ ہوئی۔ محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے تھے وہ حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی ہیں۔"

(المرتضیٰ ص ۴۸ - ۴۹)

ہوئی جوف کعبہ میں جس کی ولادت جسے حق نے آغوش رحمت میں پالا
اسی فخر کعبہ سے یہ چشم پوشی اسی کی فضیلت میں گر بڑ گھٹالا (مولف)

خانۂ کعبہ میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت ایسا شرف ہے جو انبیاء و مرسلین کو بھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن المرتضیٰ کے مولف مولانا ندوی نے معاویہ کی "حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمٹیڈ" کی وضع کردہ ایک ناقص اور موضوع حدیث کی تلوار سے اس عظیم شرف اور فضیلت پر وہابیت کی ضرب لگا کر ایک درخشاں حقیقت کو افسانہ بنانے کی جو مذموم سعی فرمائی ہے وہ ہمارے لیے دل آزار اور کرب و اضطراب کا باعث ضرور ہے مگر ہمیں موصوف کی اس حرکت پر حیرت و استعجاب اس لیے نہیں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ علیؑ کو وہ دوست نہیں رکھ سکتا جو حرامی ہوگا اور علیؑ کو وہ شخص کبھی دشمن نہیں رکھ سکتا کہ جو حلالی ہوگا۔ (اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکر ہیں اور یہ حدیث ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۸۹ پر درج ہے)

مولود کعبہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی وضاحت سے پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ اس امر کا اجمالی جائزہ لیا جائے کہ خانۂ کعبہ (جو امیر المومنین کی جائے ولادت ہے) کی عظمت کیا ہے؟

اس ذیل میں قرآن مجید کے سورۂ آل عمران پ۴ آیت ۹۶ - ۹۷ میں ارشاد

Presented by www.ziaraat.com

ہوتا ہے کہ "لوگوں کی عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ یقیناً یہی الکعبہ ہے جو مکہ میں بڑی (خیر) برکت والا اور تمام عالم کا رہنما ہے اور اس میں (حرمت کی) بہت سی واضح اور روشن نشانیاں ہیں (منجملہ اس کے) مقام ابراہیم اور جہاں آپ کے قدموں کا نشان پتھر پر ہے اور جو اس گھر میں داخل ہوا وہ امن (کے حصار) میں آگیا۔ اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض اللہ کے لیے خانۂ کعبہ کا حج بجا لائیں جنھیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو اور جس نے قدرت رکھتے ہوئے انکار کیا تو وہ یاد رکھے اللہ سارے جہاں سے بے پروا ہے۔"

مذکورہ آیت کے ذیل میں علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا، لیکن طوفان نوح میں وہ بے نشان ہو گیا۔ پھر حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس جگہ پر تخلیق آدمؑ سے پہلے ایک گھر تھا، جس کا نام "ضراح" تھا اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے۔ جب آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو انھیں حکم ہوا کہ وہ اس گھر کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں، طوفان نوح میں یہ گھر فلک چہارم پر اٹھا لیا گیا تاکہ ملائکہ اس کا طواف کرتے رہیں۔" (تفسیر بیضاوی ص ۱۸)

علامہ قطب الدین حنفی فرماتے ہیں کہ "حضرت آدم کی خلقت سے قبل خانۂ کعبہ کی جگہ ایک گھر تھا جس کا نام "ضراح" تھا، ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، پہلی بار ملائکہ مقربین نے اس گھر کی تعمیر کی، دوسری بار حضرت ابراہیم نے اسے بنایا۔ (علام بیت الحرام ص ۱۳ مطبوعہ مصر)

معلوم ہوا کہ خانۂ کعبہ کی امتیازی خصوصیت شرف اور فضیلت یہ ہے کہ اس کی تعمیر عصمت (ملائکہ اور انبیاء) کے ہاتھوں عمل میں آئی اور فلک چہارم پر یہ ملائکہ کی عبادتوں کا مرکز بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کافروں کے غاصبانہ قبضہ یا اس

مقدس گھر میں خود ساختہ بتوں کی موجودگی کے باوجود نہ اس کی عظمت متاثر ہو سکی نہ اس کے شرف پر آنچ آسکی۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ سے اخراج اصنام کے قبل، تحویل قبلہ، وجوب حج، طواف کے احکام اور ابرہہ کے لشکر سے اللہ کا خانۂ کعبہ کو بچانا اس کی عظمت، فضیلت اور تقدیس کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام چونکہ فخر کعبہ تھے۔ اسی لیے اللہ نے اپنے اس محبوب بندہ کی ولادت کے لیے اپنے ہی گھر کا انتخاب کیا جو تمام عالم میں مقدس اور مشرف گھر ہے۔

مولانا ندوی نے مروج الذہب (مسعودی) اور سیرت حلبیہ (ابن ابی الحدید) کا حوالہ دے کر جناب خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے حکیم بن حزام کی ولادت کو اندرون کعبہ بتانے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس سے آپ کی علمی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ اس روایت کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"حکیم بن حزام کی ماں چند زنانِ قریش کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئیں حالانکہ وہ حمل سے تھیں، پس انھیں اچانک درد زہ لاحق ہوا اور فرش لاکر بچھایا گیا جس پر حکیم بن حزام پیدا ہوا۔" (الاستیعاب فی فضائل الاصحاب ص ۱۲۲)

تمام اصولوں سے ہٹ کر اگر اس روایت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حکیم بن حزام کی ماں خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے درد زہ میں مبتلا تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد زہ میں شدت پیدا ہوئی اور اس وقت اس کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنا دشوار تھا۔ اس لیے حکیم بن حزام کی ولادت خانہ کعبہ میں ہو گئی۔ لیکن مذکورہ روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم بن حزام کی ماں جب کعبہ میں داخل ہوئی تو اس وقت وہ درد زہ میں مبتلا نہیں تھی۔ بلکہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد شروع ہوا۔ ہر انسان یہ جانتا

Presented by www.ziaraat.com

ہے کہ دردِ زہ شروع ہونے کے کئی گھنٹوں کے بعد زچگی ہوتی ہے۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ دردِ زہ شروع ہوتے ہی پہلی منزل میں بچہ پیدا ہو گیا ہو، اور حاملہ عورت کو اتنا موقع نہ ملا ہو کہ وہ کسی دائی یا اسپتال کی طرف رجوع ہو سکے۔ حکیم بن حزام کی ولادت کا واقعہ ایسا انوکھا اور عجیب و غریب ہے جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ مشاہدات و تجربات کی روشنی اس واقعہ کی صحت کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ روایت کے ذیل میں ابن جوزی کا کہنا ہے کہ اس روایت کو حافظ ابو نعیم نے بیان کیا ہے، اور اس کی فضیلت میں ایک طولانی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن انھوں نے سند میں روح بن صلاح کا نام لیا ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے اس لیے ہم اس روایت کا تذکرہ نہیں کرتے۔ (تذکرہ خواص الامہ فی فضائل ائمہ)

ابن جوزی کے اس بیان کی تصدیق فصول المہمہ ص ۱۴ مطبوعہ ایران، روضۃ الشہداء ص ۳۴۱ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۳ء اور ازالۃ الخفاء وغیرہ سے ہوتی ہے۔

ابن عرفہ نفطویہ جن کا شمار اہل سنت کے بڑے محدثین میں ہوتا ہے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "ہزاروں کی تعداد میں موضوع حدیثیں بنی امیہ کے دور میں خلفائے ثلاثہ کے فضائل میں وضع کی گئیں اور کھل کر علی کے فضائل پر ضرب لگائی گئی۔ بنی امیہ ان حدیثوں کے تحت خلفائے ثلاثہ کے ہمراہ خود بھی رسول اللہ اور ان کے خاندان سے نزدیکی اور تقرب پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنی جگہ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ ان حدیثوں اور روایتوں کی بنا پر بنی ہاشم کی ناک مروڑ رہے ہیں۔" (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ الجزو الثالث ص ۱۵-۱۶)

میں اپنی "اہم گفتگو" میں اس امر کی وضاحت کر چکا ہوں کہ معاویہ نے عثمان کی شان میں جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں اپنے کارخانہ حدیث سازی میں تیار کرانے کے بعد اپنے حاکموں اور گورنروں کو یہ فرمان جاری کیا تھا کہ عثمان کی شان میں حدیثوں اور روایتوں کا کافی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب سلسلے کو بند کر کے شیخین (حضرت ابوبکر و عمر) کے لیے بالکل ویسی حدیثیں اور روایتیں بیان کی جائیں جیسی کہ علی کی شان میں موجود ہیں کیونکہ یہ طریقہ میرے لیے پسندیدہ اور باعث مسرت و شادمانی ہے۔ لہٰذا ان حالات میں معاویہ کے خود ساختہ اور دروغ گو راویوں کی طرف سے حکیم بن حزام کا خانۂ کعبہ میں زبردستی پیدا ہو جانا یا پیدا کر دیا جانا حیرت انگیز و تعجب خیز ہرگز نہیں ہے۔

ابو عثمان جاحظ (جو حضرت علی اور ان کے شیعوں کا بدترین دشمن تھا) نے اپنی کتاب "عثمانیہ" میں حضرت علیؑ کے فضائل کو اخفا کر کے ان کے مقابلہ میں خلفائے ثلاثہ و دیگر اصحاب کی شان بڑھانے کے لیے بہت سی جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دیگر فضیلتوں کے ساتھ خانۂ کعبہ میں علیؑ کی ولادت کی انفرادیت، ان کے شرف، فضیلت اور عظمت کو اس روایت کے ذریعہ سبک کیا جائے۔ لیکن جسے اللہ فضیلت اور بزرگی عطا کرتا ہے اس کی عظمتوں کو نہ کوئی چھین سکتا ہے اور نہ انوار الٰہی کو مادی طاقتیں چھپا سکتی ہیں۔

حالانکہ معاویہ کا کارخانۂ حدیث سازی بنی عباس کے دور میں بھی اپنا کام کرتا رہا اور پیغمبر اسلام کے بعد مختلف طریقوں سے علیؑ اور اولاد علیؑ پر مظالم کا سلسلہ روا رکھا گیا۔ یوں ہی زمانہ گذرتا رہا، چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن علیؑ اور اہل بیتؑ اطہار کے انوار فضیلت کو باطل کی سیاہی معدوم نہ کر سکی، ارباب اقتدار نے جس شد و مد کے ساتھ آلؑ رسول کے فضائل کو اخفا کرنے کی کوشش

Presented by www.ziaraat.com

کی اسی قدر معجزانہ طور پر ان کے فضائل دشمنان اہل بیت ہی کے قلم سے اجاگر ہوتے گئے۔ حیرت ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں اور آل رسولؐ کے سخت ترین دشمنوں کی نظروں سے فضائل آل محمدؐ کیوں کر پوشیدہ رہے اور ان علماء کے خلاف تادیبی کارروائی کیوں نہیں کی گئی جنھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آل رسول کے فضائل کو اپنی کتابوں میں بیان کر کے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ یقیناً یہ معجزہ ہی ہے جو آل محمدؐ کی فضیلتیں کتابوں میں محفوظ ہیں اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی تابندہ و درخشندہ شخصیت کے ساتھ آج بھی آسمانِ فضیلت پر آفتاب کی طرح جلوہ گر ہیں۔

خانۂ کعبہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی تصدیق جن علمائے اہل سنت نے کی ہے ان کی عربی عبارتوں کو اختصار کی بنا پر نظر انداز کر کے صرف اردو ترجمہ نقل کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ابن جوزی (المتوفی ۶۵۴ھ) تذکرہ خواص الامہ میں رقم طراز ہیں۔ "روایت ہے کہ فاطمہ بنت اسد، طواف خانۂ کعبہ میں مشغول تھیں اور انھیں دردزہ لاحق تھا، جس کے لیے آپ مصروف دعا تھیں کہ خانۂ کعبہ میں ایک در بنا اور وہ اندر داخل ہوئیں اور بچہ کعبہ کے اندر پیدا ہوا۔

(۲) ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ) اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ علی ابن ابی طالب سے اس روز بیعت کی گئی جس دن عثمان بن عفان قتل ہوئے اور جائے ولادت ان حضرت کی خانۂ کعبہ ہے۔

(۳) کمال الدین، ابو سالم قاضی محمد بن طلحہ شافعی (المتوفی ۶۵۲ھ) فرماتے ہیں۔ آپ کعبہ میں خاص بیت الحرام کے اندر پیدا ہوئے اور آپ کی ولادت پیغمبرؐ کی خدیجہ سے شادی کے تین برس بعد ہوئی اور رسول اللہؐ کی عمر اس دن

اٹھائیس برس کی تھی۔ (مطالب السؤل فی مناقب آل رسول ص ۳، مطبع جعفری لکھنؤ ۱۳۰۲ھ)

(۴) احمد بن منصور گادرونی (المتوفی ۵۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ ان کی ماں فاطمہ بنت اسد تھیں۔ وہ پہلی ہاشمیہ ہیں جن سے ہاشمی ہی اولاد پیدا ہوئی۔ اور علیؑ فاطمہ کے بطن سے کعبہ میں پیدا ہوئے۔

(۵) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (المتوفی ۸۴۶ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ "روایت کی گئی ہے کہ قبل ازیں کعبہ میں دو سانپ رہا کرتے تھے، جن کو معیار الولد کہتے تھے۔ اس لیے کہ جو بچہ مکہ میں پیدا ہوتا تھا تیسرے دن خانۂ کعبہ میں لایا جاتا تھا اور رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ سانپ کہ جس کا نام محک (کسوٹی) تھا دیوار سے ظاہر ہوتا اور بچہ کو سونگھتا تھا۔ اگر بچہ حلالی ہوتا تو چلا جاتا تھا اور اگر حرامی ہوتا تو وہ پھنکار مارتا کہ جس سے وہ بچہ غش کھا جاتا۔ جب شاہِ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ اندرونِ کعبہ پیدا ہوئے تو روایت ہے کہ دونوں سانپ نمودار ہوئے اور سونگھنا چاہتے تھے کہ شاہِ ولایت نے دونوں کو چیر ڈالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مکہ والوں میں غلغلہ ہوا کہ کسوٹی کو فنا کر دیا، سب رونے لگے۔ سرور کائنات صلعم نے فرمایا کہ رنجیدہ نہ ہو۔ اللہ نے تمام عالم کے لیے علی کو کسوٹی قرار دیا ہے۔ ایک جگہ دو کسوٹیاں نہیں رہ سکتیں جو شخص علیؑ اور ان کے بچوں کو دوست رکھے گا وہ حلال زادہ ہے اور جو دشمن رکھے گا وہ حرام زادہ ہو گا۔"

(ہدایۃ السعداء)

(۶) شیخ الامام نور الدین علی بن احمد المعروف بہ صباغ مالکی مکی (المتوفی ۸۵۵ھ) رقم طراز ہیں۔ ولادت علیؑ مکہ مشرفہ میں اندرون کعبہ ۱۳ ماہ رجب کو جو خدا کا مہینہ ہے اور جس میں کشت و خون حرام ہونے کی وجہ سے آلات حرب کی جھنکار کبھی سنائی نہیں دی اور جو سلسلہ میں فرد ہے ۳۰ سنہ عام الفیل میں ہجرت سے ۲۳ یا ۲۵ سال

Presented by www.ziaraat.com

پہلے اور بعثت سے دس بارہ سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے سوا خانۂ کعبہ میں کبھی کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ یہ وہ فضیلت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان جناب کو اس سے اجلال منزلت اور اعلیٰ مرتبت اور اظہار کرامت میں مخصوص کیا ہے۔ (فصول المہمہ مطبوعہ ایران ص ۱۴)

(۷) ملا حسین کاشفی (المتوفی سنہ ۹۱۰ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ کتاب بشائر المصطفیٰ میں یزید بن قعنب سے منقول ہے کہ میں عباس بن عبد المطلب اور اولاد عزیٰ کے ایک گروہ کے ساتھ روبروئے بیت الحرام بیٹھا تھا کہ فاطمہ بنت اسد مسجد کے قریب تشریف لائیں، وہ مضطرب و بے چین تھیں، دردِ زہ اور وضع حمل کی علامتیں نمایاں تھیں۔ انھوں نے خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور بارگاہِ صمدیت میں عرض کیا کہ اے گھر کے مالک، تجھے اس کے بنانے والے کی بزرگی کا واسطہ، اس سختی کو مجھ پر آسان کر۔ راوی کہتا ہے کہ فوراً دیوار شق ہوئی اور فاطمہ اندر چلی گئیں اور ہماری آنکھوں سے غائب ہو گئیں اور ہم نے چاہا کہ کعبہ میں ہم بھی داخل ہو جائیں تو کسی طرح اندر نہ پہنچ سکے۔ چوتھے دن نکلیں تو علیؑ کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھیں۔ امام داؤد کہتے ہیں کہ علیؑ سے پہلے نہ ان کے بعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوا ہو۔" (روضۃ الشہداء، ص ۱۳۴ سنہ ۱۸۷۳ء)

(۸) علامہ نور الدین علی بن برہان حلبیؒ شافعی (المتوفی سنہ ۱۰۴۴ھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے اور آپ پیغمبر سے تیس برس چھوٹے تھے۔

(انسان العیون فی سیرت الامین المامون ملقب بہ سیرت جزء سوم ص ۱۱۷، سنہ ۱۲۸۰ھ)

(۹) شیخ عبد الحق محدث بن سیف الدین محدث دہلوی بخاری (المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں۔ "علی بن ابی طالب کا نام ان کی ماں فاطمہ بنت اسد نے حیدر رکھا اور

جب ابو طالبؑ آئے تو انھوں نے علیؑ نام رکھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیق نام رکھا جیسا کہ ریاض النضرہ میں ہے اور کنیت ابو الریحانتین، امین، شریف، ہادی، مہدی، ذو الاذن، الواعیہ اور یعسوب الامۃ وغیرہ رکھی اور راویوں کا بیان ہے کہ ولادت ان حضرت کی اندرون کعبہ ہوئی۔ (مدارج النبوۃ)

(۱۰) فاضل سعید گجراتی، شیخ قطب الدین حنفی کی مشہور کتاب "کتاب الاعلام یا اعلام مسجد الحرام کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔ مولد علی کرم اللہ وجہہ، خود کعبہ کے اندر ہے جیسا کہ ثقات کی روایتیں بتاتی ہیں۔ لیکن قول مصنف ہے کہ مکہ میں مبارک جگہیں، مقامات پیدائش اور مشہور مسجدیں ہیں۔ منجملہ اس مقام پیدائش کے کہ جو حضرت علی ابن ابی طالب ہے اور جو مولد نبی سے قریب ہے اور کوہ ابو قبیس کے نزدیک اس کی پشت پر واقع ہے جسے شعب علی کہتے ہیں وہاں ایک مسجد ہے جس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عظیم بہتان ہے، ایسے اقوال اہل بیت نبوت سے تعصب رکھنے والوں نے گڑھ لیے ہیں۔ (حاشیہ کتاب الاعلام)

(۱۱) محمد بن معتمد خاں بدخشاں کا کہنا ہے کہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولادت بروز جمعہ ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل میں بمقام مکہ واقع ہوئی اور روایت ہے کہ وہ جناب خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے اور حجرۂ کعبہ میں نہ ان سے پہلے کوئی پیدا ہوا نہ بعد میں۔ یہ وہ فضیلت ہے جس سے خدا نے انھیں مخصوص کیا تھا۔
(نزول الابرار)

(۱۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:۔ اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی فاطمہ بنت اسد کے بطن سے کعبہ کے اندر ۱۳ رجب بروز جمعہ سنہ ۳۰ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور کعبہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا، نہ ان سے پہلے نہ بعد۔" (ازالۃ الخفاء)

Presented by www.ziaraat.com

(۱۳) مولوی صدر الدین احمد بردوانی تحریر فرماتے ہیں:۔ "ولادت ان حضرت کی خانۂ کعبہ میں جمعہ کے دن ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام میں واقع ہوئی"۔ (روائح المصطفیٰ ص ۱۰ مطبوعہ مطبع احمدی کانپور ۱۳۰۲ھ)

(۱۴) شاہ محمد حسین صابری چشتی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔ "تاریخ ۱۳ رجب بعد گذرنے ۳۰ سال عام الفیل روز جمعہ وقت چاشت اور دس سال چھ دن پہلے بعثت رسول خدا سے، خانۂ کعبہ میں آپ پیدا ہوئے"۔ (آئینۂ تصوف ص ۹ مطبوعہ رام پور ۱۳۱۲ھ)

(۱۵) مولوی عبید اللہ بسمل امرتسری رقم طراز ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے شادی کے تین برس بعد آپ عین خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک اٹھائیس برس کا تھا۔ (ارجح المطالب ص ۴۴۶ مطبوعہ نول کشور لاہور)

(۱۶) مولوی عبد الحمید خان دہلوی سیر الخلفاء میں تحریر فرماتے ہیں "طبقات ابن سعد اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ مکہ مکرمہ میں بروز جمعہ ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور آپ سے پہلے خاص بیت اللہ کی چاردیواری کے اندر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا"۔ (رسالہ مولوی دہلی جلد ۵ نمبر ۲، ۱۲ شعبان ۱۳۴۷ھ)

مذکورہ علمائے اہل سنت کی کتابوں اور عبارتوں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے کوئی دوسرا شخص خانۂ کعبہ کے حدود میں نہ پیدا ہوا ہے نہ قیامت تک ہوگا۔

مولانا ندوی نے اپنی فریب کاری سے اس مسلمہ تاریخی حقیقت کے تابندہ نقوش کو معدوم اور مسموم کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ نہ اہل علم کے نزدیک

مستحسن ہے نہ قابل ستائش۔ بلکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو وہابیت کی عینک سے آل محمدؑ کی منقصت میں باطل روایتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا موصوف غالباً حضرت شمس تبریز، مولانا جلال الدین رومی، عبد الرحمٰن نور الدین جامی، شیخ مصلح الدین سعدی، بو علی قلندر، حضرت نظام الدین اولیاء، خواجہ فرید الدین عطار، شاہ نعمت اللہ ولی، شاہ نیاز بریلوی، امیر خسرو، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری وغیرہ سے واقف اور متعارف ہوں گے۔ ان صوفیائے کرام کا تصور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے بارے میں کیا تھا؟ چند نمونے ملاحظہ فرمالیں تاکہ کسی اعتراض کی گنجائش نہ رہ جائے۔

جامی فرماتے ہیں:۔

تو سلطان صاحب سریر آمدی … عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر، آمدی
بہ ہر صورت دل پذیر آمدی … سَمِیْعٌ، عَلِیْمٌ بصیر آمدی
علی نام کردی بہ ملک عرب … بہ سوئے غریباں امیر آمدی

نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:۔

امامت را کسے شاید کہ شاہِ اولیاء باشد … بہ زہد و عصمت و دانش مثال انبیاء باشد
امام حق کسے باشد کہ باشد ہمسرِ احمد … چنیں رفعت کہ می بینی بجز حیدر کجا باشد

بو علی قلندر فرماتے ہیں:۔

اعلیٰ قصر شان تو، روح القدس دربان تو … تا رفتہ تا ایوان تو شہباز فکر انبیاء
نور شمع حق زیب سپہر نہہ طبق … گیرد ملک از تو سبق اے پیشوائے اولیاء

حضرت احمد جام معروف بہ زندہ پیل فرماتے ہیں:۔

گر نجات آں جہاں مطلوب داری اے عزیز … دست در دامانِ آل مصطفیٰ باید زدن

امام شافعی نے یہاں تک کہہ دیا:۔

Presented by www.ziaraat.com

مات شافعی ولیس یدری   علی ربہ ام ربہ اللہ

(شافعی مرگیا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کا رب علی ہے یا اللہ ہے)

اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اللہ اور رب کے معنوی فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہاں علی کو اللہ کہنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ اپنا کار راست خود چلاتا ہے یا علی کو اپنا ہاتھ، اپنا چہرہ، اپنی آنکھ اپنی زبان اپنا نفس اور اپنی آیت کہہ کر ان کے ذریعہ چلاتا ہے جس طرح کہ اس نے عاملان قضا و قدر مقرر فرمائے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:۔

صاحب ذوالفقار است   نائب کردگار است

(علیؑ صاحب ذوالفقار ہے، اور علیؑ اللہ کا نائب ہے۔)

حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں:۔

بود با جملہ انبیاء در سیر   بود با مصطفیٰؐ نبی جہرا

(حضرت علیؑ ہر نبی کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہے لیکن محمد مصطفیٰؐ کیلئے کھل کر ظاہر بظاہر آگئے)

تاریخ گواہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی سخت مرحلہ درپیش آیا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔ نَادِ عَلِیًّا مَظْهَرَ الْعَجَائِب ۔۔۔۔ الخ
اے رسول مدد کے لیے علی کو آواز دو جو عجائبات کا مظہر ہے اور تم ہر موقع پر اسے اپنا مددگار پاؤ گے۔

حضرت علیؑ کے ان الوہیانہ صفات اور محیر العقول کمالات سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ ایسی پر فضیلت اور فخر روزگار ہستی کی ولادت کے لیے خانۂ کعبہ کا قیام اور تعمیر ضروری تھی جو حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور ملائکہ مقربین کے ہاتھوں اس لیے عمل میں لائی گئی تاکہ آپ کی ولادت کا شرف اسے حاصل ہو سکے۔

میرے نزدیک حضرت علی خانۂ کعبہ میں پیدا ہو کر مشرف نہیں ہوئے بلکہ خانۂ کعبہ کو اللہ نے علیؑ کی جائے ولادت قرار دے کر اسے مزید شرف بخشا ہے۔

ان تمام ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں نہ حکیم بن حزام کا من گھڑت اور فرضی افسانہ کوئی حقیقت رکھتا ہے نہ مولانا ابوالحسن ندوی کی بچکانی تحریر کی کوئی اہمیت ہے۔

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourrier.com

Presented by www.ziaraat.com

باب الثالث
حضرت عمر بن الخطاب

خدا کی قدرت کہ ابن حنتمہ، ابن حنتمہ سے عمر ہوا
اور پھر، عمر اسے عمر نیا، بن گیا
(ازالۃ الخفا ص ۱۵۸)

MAULANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711

پیدائش

تاریخ کی کتابوں میں حضرت ابوبکر کی طرح، حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ عمر نواز علماء کا صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ طلوع آفتاب رسالت سے ستائیس برس قبل اور ہجرت نبوی سے چالیس سال قبل کفر کی تاریکی میں کفار مکہ کی ایک شاخ بنی عدی سے تعلق رکھنے والے ایک لکڑہارے خطاب بن نوفل کے یہاں پیدا ہوئے۔

علامہ شبلی بھی حضرت عمر کی تاریخ پیدائش بتانے سے قاصر ہیں اور بڑی تحقیق و جستجو کے بعد صرف اتنا ہی تحریر کر سکے کہ "حافظ عساکر نے تاریخ دمشق میں عمرو بن عاص کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے کہ میں اپنے چند اصحاب کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا تھا کہ دفعتاً ایک شور اٹھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خطاب کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔" (الفاروق ص ۲۷-۲۸)

ترجمہ اسد الغابہ ج ۷، ص ۴۷، میں ابن اثیر کے حوالے سے ہے کہ حضرت عمر کی

پیدائش واقعہ فیل کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ حضرت عمر کا قول ہے کہ میں واقعۂ فجار اعظم کے چار سال پہلے پیدا ہوا۔ (واللہ اعلم)

حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا ظہور میں نہ آنا اس بات کی دلیل ہے ان کی خاندانی حیثیت یا ذاتی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ ابتدائی دور کے مورخین ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

نام، کنیت اور القاب

حضرت عمر کی اختلافی شخصیت کی طرح ان کے نام میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ پہلے آپ کا نام یہودیوں کے نام کی طرح عمیر تھا، بعد میں اپنی ہیئت بدل کر عمر ہو گیا۔ کنیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابو حفص یا ابو حفصہ تھی۔ لقب فاروق اعظم مشہور ہے، مگر معلوم نہیں کیوں؟ جب کہ آنحضرت نے یہ لقب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو مرحمت فرمایا تھا اور تمام مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ میرے بعد اسلام میں فتنہ و فساد برپا ہوگا اور جب یہ وقت آئے تو تم علی کا ساتھ دینا اور ان کی پیروی کرنا کیونکہ وہی حق و باطل کے درمیان فاروق ہیں (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۵) اسی صفحہ پر یہ بھی تحریر ہے کہ علیؑ مجھ پر سب سے پہلے ایمان لائے علیؑ ہی سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ کریں گے۔ علیؑ ہی جملہ مومنین کے سردار ہیں اور علیؑ ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہیں۔

ریاض النضرہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آنحضرتؐ علیؑ سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم ہی صدیق اکبر اور تم ہی فاروق اعظم ہو۔

(ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۵۵)

شاہ عبد العزیز محدث کا کہنا ہے کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی کنیت ابوتراب، ابو الریحانتین اور القاب

Presented by www.ziaraat.com

ذوالقرنین، یعسوب الدین، یعسوب قریش، امین، ہادی، مہدی، سابق، یعسوب الامۃ، یعسوب المومنین، صدیق اور فاروق تجویز فرمائے تھے۔ ان سب کی روایتیں موجود اور ثابت ہیں۔ (فتاوائے عزیزی ج ۲ ص ۲۱۱)

تاریخ الامم والملوک میں ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں بندۂ خدا، رسولؐ کا بھائی اور صدیق اعظم اور فاروق اعظم ہوں۔ میرے سوا اگر کوئی دوسرا اپنے کو صدیق یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے (تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

حُلیہ

حضرت عمر کے حقیقی جاں نثار اور پرستار مولوی عبدالشکور پاٹانالوی (لکھنوی) نے اپنی کتاب خلفائے راشدین میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمر کا رنگ سفید سرخی مائل تھا۔ زمانۂ قحط میں ناموافق غذا کے استعمال سے کالا ہو گیا تھا، رخساروں پر گوشت بہت کم تھا۔ قد اتنا لمبا تھا کہ جب لوگوں کے درمیان کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی سواری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ (خلفائے راشدین ص ۵۲) مولوی مسیح الدین کاکوروی نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر بھینگا (احول) دیکھتے تھے۔ (تاریخ خلفاء ص ۳۴۴) علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر، لانبے ڈیل ڈول والے اور گنجے تھے۔ جسم پر سرخ رنگ کے بالوں کی کثرت تھی۔ مونچھیں لمبی تھیں جن کے دونوں کناروں پر سرخی نمایاں رہتی تھی، دونوں رخسار پچکے ہوئے اور اندر کو دھنسے تھے۔

یعقوب بن سفیان نے اپنی تاریخ میں سند جید سے جو زر بن حبش تک پہنچتی ہے یہ روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عمر کو دیکھا ہے وہ بائیں ہتھے، گنجے اور سیاہ فام تھے اور اس قدر لمبے تھے کہ معلوم ہوتا کسی جانور پر بیٹھے ہیں۔ ترجمہ اسد الغابہ میں سماک سے روایت ہے کہ حضرت عمر کی صورت قبیلہ بنی سدوس کے لوگوں سے ملتی تھی اور جب وہ چلتے

تو ایسا لگتا کہ سواری پر ہیں۔ داڑھی اتنی گھنی اور لمبی تھی کہ جب آپ چولھا پھونکتے تھے تو دھواں داڑھی کے درمیان سے خارج ہوتا تھا (خلاصہ عبارت ترجمہ اسد الغابہ ص ۹۲ تا ۱۰۶) اصابہ میں ہلال ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر کو میں نے دیکھا ہے وہ ایسے ڈیل ڈول والے تھے گویا قبیلۂ بنی سدوس سے ہوں۔ علامہ ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا قد طویل اور رنگ سیاہی مائل تھا، سر گنجا، مونچھیں لمبی اور داڑھی جھاڑی نما تھی۔ پیروں سے معقل تھے، ایسا لگتا کہ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے کام کاج کرتے اور اسی سے کھانا کھاتے۔ رنگ کے بارے میں آپ کی اولادوں کا کہنا تھا کہ یہ سیاہی ہم لوگوں کو ننہال سے وراثت میں ملی ہے (الاستیعاب ج ۲ ص ۵)

ننہالی وراثت کی بنا پر حضرت عمر کا سیاہ فام ہونا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ آپ کی ماں حبشن تھیں۔ بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ زمانۂ قحط میں گھی اور گوشت کا استعمال ترک کر دینے سے آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ یہ تاویل اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ عرب کی آب و ہوا میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی کہ گھی اور گوشت کا استعمال نہ کرنے والا انسان سیاہ فام ہو جائے۔ آج بھی عرب میں ہزاروں لاکھوں لوگ گھی کے بجائے صرف روغن زیتون پر اکتفا کرتے ہیں اس کے باوجود وہ لوگ سرخ و سفید نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں حضرت عمر کا زمانۂ قحط میں گھی کے بجائے روغن زیتون کھا کر سیاہ ہو جانے کی داستان کو آپ کے ننہالی عیب کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے۔

حضرت عمر کے پیروں کا معقل ہونا یا ان کی ایڑیوں کے ملے ہونے کا سبب بھی پیدائشی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بھی ایک تاریخ ہے اور وہ یہ ہے کہ خالد بن ولید نے موصوف کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ خالد بن ولید اور حضرت عمر جب بچپن کی سرحدوں میں تھے تو ایک دن کسی بات پر دونوں آپس میں لڑ پڑے۔ خالد نے (جو حضرت عمر کے خالہ زاد بھائی بھی تھے) حضرت عمر کو پٹک دیا اور نہ جانے کون سا داؤں استعمال

Presented by www.ziaraat.com

کیا کہ آپ کی ٹانگ ہی ٹوٹ گئی بعد میں علاج سے وہ جڑ تو گئی لیکن عیب باقی رہ گیا۔
چنانچہ خالد بن ولید اور حضرت عمر کے درمیان عداوت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی، جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو یہ کہہ کر معزول کر دیا کہ خالد میری زندگی میں کسی عہدہ پر نہیں رہ سکتے۔ (خلاصۂ عبارت سیرت حلبیہ ص ۱۹۸ ج ۳)

والدین اور نسب

حضرت عمر کے باپ خطاب ابن نوفل تھے جو کفار مکہ کی شاخ بنی عدی سے تھے۔ ان کی ماں حنتمہ جنھیں عام طور پر ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کہا جاتا ہے۔ نسلی اعتبار سے حبشن تھیں۔ (مروج الذہب برحاشیہ کامل ج ۵ ص ۱۰۹ مطبوعہ مصر) مسعودی کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر کی ماں حنتمہ کا نسلی تعلق عرب سے نہیں تھا بلکہ وہ حبشی نسل کی ایک سیاہ فام عورت تھیں۔ لہذا ایسی صورت میں ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کیوں کر ہو سکتی ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ہشام نے کوئی حبشن لڑکی کہیں پائی ہو اور وہ اٹھا کر اپنے گھر لائے ہوں اور اس کی پرورش کی ہو۔ اسی بنا پر اہل عرب نے اسے ہشام کی بیٹی تسلیم کر لیا ہو کیونکہ اس زمانے میں عربوں میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کی پرورش کرتا تھا تو وہ اسی کی اولاد کہی جاتی تھی جیسے کہ زید کو آنحضرتؐ نے پالا تھا اس لیے لوگ انھیں زید بن محمد کہنے لگے تھے۔

اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ درحقیقت حضرت عمر کا نانا کون تھا؟ علامہ شبلی نے ہشام بن مغیرہ بتایا ہے جبکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب میں "حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ" لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق حنتمہ ابوجہل کی چچا زاد بہن ہوتی ہے اور ابن اثیر کے مطابق ابوجہل کی حقیقی بہن قرار پاتی ہے۔ اسد الغابہ میں ابن مندہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر کی ماں ابوجہل کی حقیقی بہن تھیں اور ابونعیم سے روایت

ہے کہ اس ہشام کی بیٹی تھیں جو ابوجہل کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس طرح ابوجہل ہشام کا ماموں قرار پاتا ہے۔ (ترجمہ اسد الغابہ ج ۷، ص ۳) علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا نانا ہاشم بن مغیرہ تھا جو قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔

ان اختلافات کے درمیان یہ فیصلہ دشوار ہے کہ حنتمہ دراصل کس کی بیٹی تھی یا اس کا نسلی تعلق اگر عرب سے تھا تو اس کا حقیقی باپ کون تھا؟ ہشام یا ہاشم؟ اور ابوجہل حضرت عمر کا کون تھا؟ ماموں یا چچا اور؟ چونکہ انساب عرب کی کتابیں ناپید ہیں اس لیے یہ تحقیق محال ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ کس نے کس کی کوکھ سے جنم لیا اور کس کے ساتھ کون بیاہی گئی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں حبش کی لڑکیاں بکثرت عرب کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لیے آتی تھیں اور لوگ انھیں خرید کر اپنی بیٹی یا بیوی بنا لیا کرتے تھے۔ اس لیے حضرت عمر کی ماں کا حبشن ہونا یا حضرت عمر کے فرزند کا یہ کہنا کہ سیاہی ہم لوگوں کو ننھیال سے وراثت میں ملی ہے بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر حنتمہ کے بارے میں ابن قتیبہ کا یہ کہنا ہے کہ "حضرت عبدالمطلبؑ نے حنتمہ نام کی ایک کنیز خریدی تھی جو جنگلوں میں بکریاں چرایا کرتی تھی نوفل نامی ایک نوجوان نے اس کنیز سے ناجائز تعلق پیدا کیا اور اس کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا اور وہ اکثر و بیشتر جنگلوں میں جا کر اس کی عصمت دری کرتا رہا جس سے ایک لڑکا خطاب نامی پیدا ہوا اور جب وہ جوان ہوا تو اس نے اپنی ماں (حنتمہ) کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے حضرت عمر پیدا ہوئے۔

ابن حجاج بغدادی اپنی کتاب لسان الواعظین میں لکھتے ہیں کہ "جناب عبدالمطلب کی ایک کنیز حبشیہ کا نام ضحاکہ تھا وہ بلا کی چلبلی اور شہوت پرست تھی اس لیے اکثر وہ بے احتیاطی کی مرتکب ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی شہوت پرست عورت

Presented by www.ziaraat.com

کی نگرانی مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کو چرمی پائجامہ پہنا کر قفل لگا دیا جاتا تھا تاکہ پائجامہ نہ کھل سکے اور نہ اس سے کوئی فعل بد سرزد ہو سکے۔ اس کا کام جنگلوں میں اونٹوں کا چرانا تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں اونٹ چرا رہی تھی کہ حضرت عمر کے دادا نوفل سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف نے بھی ضحاکہ کی سی طبیعت پائی تھی چلبلی حسن پر نظر جو پڑی تو طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اپنی تہہ بند کو اتار کر درخت میں لٹکایا اور آہستہ آہستہ اس کا پائجامہ کھولا اور جی بھر کے منہ کالا کیا جس سے حضرت عمر کے باپ خطاب پیدا ہوئے جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو جوانی کے غیر شائستہ جذبات نے انھیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ضحاکہ مسن ہونے کے باوجود نوخیز نوجوانوں کو اپنے نفسانی خواہشات کا نشانہ بنایا کرتی تھی۔ چنانچہ بڑھاپے میں طوفان خیز نفسانی جذبات نے اپنے بیٹے خطاب ہی کو تکمیل ذوق کا نشانہ بنایا اور اس سے اپنی ہوس پوری کی اس طرح حنتمہ عالم وجود میں آئی۔ اس نے بھی اپنی ماں جیسی طبیعت پائی تھی جب جوان ہوئی تو خطاب نے اسے بھی نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ وصل کی لذتوں سے لطف اندوز ہوئے اور انھیں لذتوں کا نتیجہ حضرت عمر ہیں۔ (رسالہ شرح کنز مکتوم ص ۵۰-۵۱ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ)

ابن حجاج کے اس بیان کے تحت حضرت عمر کی والدہ حنتمہ اور باپ خطاب کے درمیان تین طرح کے رشتے تھے۔ پہلا رشتہ باپ اور بیٹی کا تھا، دوسرا بھائی بہن کا اور تیسرا رشتہ بیوی اور شوہر کا تھا۔

ابن قتیبہ دینوری کا کہنا ہے کہ :۔ "خاندان فہم کی ایک عورت حضرت عمر کے دادا نوفل کے تصرف میں تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عمر کے چچا عمرو نے اس عورت کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے زید پیدا ہوا، اس طرح زید بن عمرو کی ماں خطاب کی بھی ماں تھیں اور زید سعید کے باپ تھے۔

(معارف مطبوعہ مصر ص ۳۷)

نسبی رشتہ سے زید حضرت عمر کے چچازاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی اور خاندان فہم کی وہ عورت حضرت عمر کی دادی بھی تھی اور چچی بھی اور عمرو اپنے باپ نوفل کے بیٹے بھی تھے اور ہم زلف بھی اور نوفل اس عورت کے شوہر بھی تھے اور سسر بھی، اور وہ عورت عمر کے باپ خطاب کی ماں بھی تھی اور بھاوج بھی۔ غرض کہ نہ جانے کون کون سے رشتے پیدا ہو گئے۔

اس تاریخی تجزیہ سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عمر صحیح النطفہ یا صحیح النسب نہیں تھے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ حضرت عمر کسی خاندانی یا نسلی تذکرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے ابو عثمان سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر کو اپنے دور خلافت میں جب یہ معلوم ہوا کہ اشعار کے راویوں اور حالات سے واقف کار لوگوں میں کچھ لوگ ماضی کے نسبی عیبوں کو بیان کرتے ہیں اور گڑے مردے اکھاڑتے ہیں تو آپ منبر پر گئے اور فرمایا کہ خبردار نسب کے عیبوں اور آباء و اجداد کی اصلیت پر بحث نہ کیا کرو کیونکہ اگر آج یہاں میں یہ حکم دوں کہ ان دروازوں سے اس شخص کے علاوہ کہ جو نسبی عیوب سے پاک ہو، کوئی نہ نکلے تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نکل کر باہر نہ جا سکے گا۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۲۴ مطبوعہ مصر)

ابتدائی حالات

حضرت عمر کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اگر تاریخ کے آئینہ میں آپ کی ابتدائی زندگی کے عکس پر نگاہ ڈالی جائے تو آپ صرف ضجنان کے میدان میں اونٹ چراتے، جنگلوں اور پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کر گلی گلی بیچتے ہوئے عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں لنگوٹ باندھ کر کشتیاں لڑتے ہوئے اور شراب خوری کے ساتھ عرب کی حسیناؤں سے عشق فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

Presented by www.ziaraat.com

علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ سنِ رشد کو پہنچ کر ان کے باپ خطاب نے جو خدمت ان کے سپرد کی وہ اونٹ چرانا تھا۔ خطاب ان کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کرتے، تمام دن ان سے اونٹ چرانے کا کام لیتے اور جب یہ تھک کر دم لینا چاہتے تو انھیں سزا دیتے۔ جس میدان میں حضرت عمر کو یہ خدمت انجام دینا پڑتی اس کا نام ضجنان تھا جو مکہ سے مقام قدید دس میل کے فاصلے پر تھا۔ زمانۂ خلافت میں حضرت عمر کا ایک بار ادھر سے گذر ہوا تو آپ کو نہایت عبرت ہوئی اور آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اللہ اکبر ایک زمانہ تھا کہ میں یہاں نمدے کا ایک کرتا پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا اور جب تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھ کی مار کھاتا۔

(الفاروق ۲۷-۲۸)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بچپن میں لوگ حضرت عمر کو ان کی ماں کی نسبت سے عکاظ[1] کے میلوں اور بازاروں میں حنتمہ والی کہہ کر پکارتے تھے، حتی کہ عورتیں بھی اسی نام سے پکارتی تھیں۔ مسماۃ خولہ کا قول تھا کہ خدا کی قدرت ہے کہ ابن حنتمہ، ابن حنتمہ سے عمرا ہوا اور پھر عمرا سے عمر میاں بن گیا (ازالۃ الخفاء ص ۱۵۸) شاہ صاحب کے اس بیان سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ حضرت

۱؎ عکاظ اس مقام کا نام ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ چونکہ اس میلے میں زیادہ تر کھالوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اس لیے چمڑے کی نسبت سے اس کا نام عکاظ ہوا۔ اس میلے میں شعر و سخن کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور عرب کے شعراء قابل ذکر کارناموں کو نظم کر کے عوام سے خراج تحسین لیتے تھے۔ دنگلوں کا بھی اہتمام ہوتا تھا جس میں لوگ کشتی بازی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسلام کے بعد حج کے اجتماع نے اس بازار کو سرد کر دیا۔

عمر کو ماں کی طرف منسوب کر کے پکارا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ لوگ ان کی ولدیت سے مطمئن نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ عورتیں آپ کا شمار صنف نازک میں کرتی تھیں۔

شاہ صاحب نے ایک اور دلچسپ وضاحت فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عمرو عاص حضرت عمر کی نسبی فضیلت کے قائل نہیں تھے اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا لعنت کرے اس دن پر کہ جس دن میں حضرت عمر کی طرف سے حاکم بنوں۔ خدا کی قسم میں نے انھیں اور ان کے باپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ بجز قطران[1] کی ایک چادر کے کوئی دوسرا کپڑا ان کے تن پر نہیں رہتا تھا اور وہ جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر اسے گلی گلی بیچا کرتے تھے۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۱۸۳)

اس کا مقصد یہ ہوا کہ حضرت عمر اور ان کے باپ عمرو عاص کی نظر میں بھی انتہائی پست اور کمتر تھے۔ جبکہ خود عمرو عاص کی ماں نابغہ عرب کی ایک مشہور طوائف تھی اور اجرت پر اوباش و بدقماش لوگوں کے خلوت کدے آباد کیا کرتی تھی۔ اس کے مکان پر رایت زنا لہرایا کرتا تھا۔ چنانچہ عمرو جب پیدا ہوا تو ابولہب، امیہ، ہشام بن مغیرہ (حضرت عمر کے نانا) عاص بن وائل اور ابوسفیان نے عمرو کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ معاملہ یوں طے ہوا کہ عمرو کی ماں (نابغہ) نے ان پانچوں آدمیوں کے درمیان یہ تجویز رکھی کہ عمرو کی صورت جس سے مل جائے اسی کا بیٹا تسلیم کر لیا جائے چنانچہ اس کی صورت عاص سے مل گئی اور وہ اسی کا بیٹا مان لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب عمرو بن عاص ایسے شخص کی نظر میں حضرت عمر اور ان کے باپ خطاب کی یہ منزلت تھی تو عرب کے شرفاء میں ان کا کیا مقام رہا ہو گا۔

۱؎ قطران ایک بہت ہی معمولی قسم کا کپڑا ہوتا تھا جو گھوڑوں اور اونٹوں کا جامہ بنانے کے کام آتا تھا۔

Presented by www.ziaraat.com

علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ :۔ "آغاز شباب میں حضرت عمر ان شریفانہ مشغلوں میں مشغول ہوئے جو عرب کے شرفا میں معمول تھے۔" (الفاروق ص ۲۸)

زمانۂ جاہلیت اور کفر کی تاریکی میں پروان چڑھنے والے عرب کے بدّو، ان جاہل بدّؤں میں شرفاء اور ان شرفا میں شریفانہ مشغلے ایسی عجیب و غریب بات ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی۔ ممکن ہے علامہ شبلی کا یہ اشارہ حضرت عمر کی اس مخصوص شریفانہ عادت کی طرف ہو جسے کے راز دار صرف افلح تھے۔

تعلیم، رنگین مزاجی، پہلوانی اور شراب نوشی

تعلیم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ حضرت عمر اپنے ماموں علامہ ابو جہل کے شاگرد تھے۔ کیونکہ آپ کے مدبرانہ کارناموں میں بھی جہل نمایاں ہے آپ کی رنگین مزاجی کی داستانیں بھی تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں جن کی وضاحت آگے ہوگی۔ مکہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ کو بھی حسینان عرب سے بلا کا شغف رہا ہے۔ آپ بنت رز کے عاشق بھی تھے اور اپنے اس مشغلہ کو آپ نے اپنی آخری سانس تک برقرار رکھا۔

مصر کے مشہور ادیب اور مصنف محمد حسین ہیکل نے کھل کر ان واقعات کا اعتراف کیا ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔ "جب حضرت عمر کی جوانی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رخصت ہوگئی تو (بڑھاپے میں) ان کے دل میں پھر نکاح کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے نو عورتوں سے شادیاں کیں۔ حضرت عمر کی زندگی اگر اور وفا کرتی تو وہ اور بھی شادیاں کرتے۔ (عمر فاروق اعظم مترجمہ حبیب اشعر ص ۷۴)

حضرت عمر کو پہلوانی اور کشتی بازی کا بھی بے حد شوق تھا، گویا موصوف اپنے

اپنے وقت کے گاما تھے اور میدان جنگ کے علاوہ ہر میدان میں باضابطہ لنگوٹ باندھ کر اپنی پہلوانی اور طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ علامہ شبلی نے آپ کی کشتی بازی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے اور علامہ بلاذری کی کتاب، کتاب الاشراف سے بہ سند یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں کشتیاں لڑتے تھے۔ (الفاروق ص ۲۸)

حضرت عمر بچپن سے شراب کے شوقین تھے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ نے شراب ترک نہیں کی۔ تاریخ میں یہ واقعہ انتہائی عبرت ناک اور قابلِ افسوس ہے کہ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود آپ نے ماہ رمضان میں شراب کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں عبدالرحمٰن بن عوف کو ہڈی سے مارا اور شعر پڑھے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے خدا سے کہہ دو کہ وہ مجھے شراب پینے سے منع کرے اور ہمارا کھانا پانی بند کرے۔ ہم نے آج سے روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ (نور ایمان، ص ۴۶ بحوالۂ ربیع الابرار و فتح الباری فی شرح بخاری)

حضرت عمر نے خود بھی اپنی شراب نوشی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔ "میں اسلام سے کوسوں دور تھا، جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور خوب چاؤ سے پیتا تھا۔ ہماری ایک محفل جمتی تھی جس میں اکثر نوجوان شریک ہوتے تھے۔" (عمر فاروق اعظم مترجمہ حبیب اشعر ص ۲۷)

پیشہ

حضرت عمر کا خاندانی پیشہ دلالی تھا۔ مولوی وحید الزماں کا کہنا ہے کہ آپ بھی زمانۂ جاہلیت میں بائع و مشتری کے درمیان دلالی کیا کرتے تھے (انوار اللغہ پارہ ۲ ص ۴۳) دلالی کے علاوہ آپ لکڑہارے کا پیشہ بھی اختیار کیے ہوئے تھے اور جنگلوں سے لکڑیاں

Presented by www.ziaraat.com

کاٹ کر اسے گلی گلی فروخت کیا کرتے تھے، اونٹوں کا چرانا بھی آپ کا پیشہ تھا، ابن ابی الحدید نے ابو احمد کے مصنفات سے بہ سند یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت عمر ولید بن مغیرہ کے یہاں خدمت گاری پر مامور تھے اور اکثر انھوں نے ولید کے تجارتی قافلہ کے ہمراہ دور دراز کا سفر بھی کیا۔ دوران سفر آپ کا کام اونٹوں کا چرانا ہوتا اور جب قافلہ بغرض تجارت کہیں قیام پذیر ہوتا تو آپ سامان تجارت اپنے سر پر بار کر کے فروخت کنندہ کے ہمراہ پھیری کیا کرتے تھے۔ (خلاصۂ عبارت شرح ابن الحدید ج ۳ ص ۱۴۳)

حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام

حضرت عمر نے اسلام کیونکر قبول کیا؟ اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمن ابو جہل (جو حضرت عمر کا ماموں بھی تھا) نے کفار مکہ کے ایک اجتماع میں یہ اعلان کیا جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سو اونٹ یا چالیس ہزار درہم انعام میں دیے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر حضرت عمر کے دل میں بھی یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس انعام کو حاصل کر کے معاشی بدحالی کو دور کیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت آپ نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں محمدؐ کو قتل کروں گا۔ تلوار لے کر ارقم کی گھر کی طرف جہاں سرکار دو عالم قیام فرما تھے، روانہ ہوئے۔ راستہ میں کسی نے پوچھا کہ اے عمر! یہ تلوار لے کر کہاں چلے۔ کہا محمدؐ کو قتل کرنے۔ اس شخص نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر کیوں نہیں لیتے۔ تمہارے بہنوئی اور بہن بھی تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ غیظ و غضب کا طوفان بہنوئی کے گھر کی طرف مڑ گیا، اور آپ جا کر ان سے بھڑ گئے۔ خوب جم کر مار پیٹ ہوئی۔ بہن نے مداخلت کی تو اس بے چاری کے منہ پر ایسا زوردار گھونسہ رسید کیا کہ وہ لہو لہان ہو گئی۔ اس

حرکت پر آپ کے بہنوئی نے آپ کی وہ خاطر کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ غرض کہ آپ اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگے اور مجنوں حلیہ میں ارقم کے گھر پہنچے۔ آنحضرتؐ نے عمر کے خطرناک ارادوں کو فوراً بھانپ لیا۔ آپ نے آگے بڑھ کر کلائی پکڑی اور فشار دینا شروع کیا۔ محمدی فشار کچھ ایسا تھا کہ آپ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے رسول اللہؐ نے فرمایا اے عمر اب بتا کہ تو کس ارادے سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ فشار کی شدت سے حضرت عمر کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اب جان کا بچنا مشکل ہے تو بولے، حضور میں تو اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ الغرض رسول اللہؐ ایک طرف حضرت عمر کی کلائی تھامے فشار دے رہے تھے اور دوسری طرف آپ کی زبان پر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ تھا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو معمولی ترمیم کے ساتھ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حضرت عمر کا ستائیسواں سال تھا کہ جب عرب میں آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ مبعوث بہ رسالت ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی۔ حضرت عمر کے گھرانے میں زید کی زوجہ کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل غیر مانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید اسلام لائے۔ سعید کا نکاح حضرت عمر کی بہن فاطمہ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ اسی خاندان میں ایک اور شخص نعیم بن عبد اللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن حضرت عمر ابھی تک اسلام سے بے گانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ جو لوگ قبیلہ میں اسلام لا چکے تھے ان کے سخت دشمن ہو گئے لبینہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشہ مارتے، اور مارتے مارتے جب تھک جاتے تو کہتے، ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔

Presented by www.ziaraat.com

لبینہ کے سوا اور بھی جس جس پر ان کا قابو چلتا اسے زدوکوب کرنے سے باز نہ آتے۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس پر چڑھ جاتا اترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر بھی وہ ایک شخص کو بھی اسلام سے بدل نہ سکے۔ آخر مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ بانئ اسلام ہی کا قصہ پاک کر دیں۔ تلوار کمر سے لگائے سیدھے رسول اللہ کی طرف چلے۔ راہ میں نعیم نے کہا خود تمھاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے اور بولے کہ میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست بہ گریباں ہوئے اور جب بہن بچانے آئیں تو ان کی بھی خبر لی یہاں تک کہ ان کا بدن لہولہان ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رسول اللہ کی طرف روانہ ہوئے اور آستانۂ مبارک پر دستک دی۔ اندر قدم رکھا تو رسول اکرم (صلعم) خود بڑھے اور دامن پکڑ کر فرمایا کہ کیوں عمر کس ارادے سے آیا ہے۔ نبوت کی پر رعب آواز نے انھیں کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ بولے کہ ایمان لانے حاضر ہوا ہوں۔"

(خلاصہ عبارت الفاروق ص ۳۲-۳۳)

علامہ شبلی نے "اعلان ابوجہل" اور "فشار رسالت" کے واقعہ کو نظر انداز کیا ہے جو اُن کے مسلک کے اعتبار سے ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر جب ولید بن مغیرہ کے تجارتی قافلہ کے ساتھ روم کے سفر پر تھے تو وہاں کے راہبوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اسلام کے توسل سے آپ کو حکومت ملے گی لہٰذا آپ اس پیشین گوئی کو نظر میں رکھ کر مسلمان ہوئے۔ پیشین گوئی کے اس واقعہ کو طبری نے ج ۲ ص ۲۲۵ میں بیان کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء میں بھی ہے۔ مسعودی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ حضرت عمر کا اسلام خلوص اور عقیدت سے کوسوں دور تھا۔

٭ ٭ ٭

عمری نوشتہ

حضرت عمر کے منافقانہ اسلام، مشرکانہ زندگی، عقیدۂ بت پرستی اور آل محمدؐ سے دشمنی کے واضح ثبوت میں تمام تاریخی شواہد سے قطع نظر، عمر ہی کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ایک اہم نوشتہ پیش خدمت ہے۔ اس نوشتہ کے بعد مزید کسی تبصرہ یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس خفیہ تحریر کا راز اس وقت کھلا جب سنہ ۶۱ ہجری میں حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بہتر جاں نثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کر دیے گئے، تو عبداللہ ابن عمر نے یزید کو ایک خط لکھا اور کہا کہ تو نے آل رسولؐ کو شہید کر کے اسلام میں ایک فتنۂ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس خط کے جواب میں یزید نے عبداللہ ابن عمر کو لکھا کہ اے احمق! یہ راہ تو تیرے باپ ہی کی دکھائی ہوئی ہے لہٰذا حسینؑ کے قتل کا الزام بھی تیرے باپ ہی کے سر جاتا ہے۔ اور اگر اس امر میں تجھے کوئی اختلاف ہے تو تیرے باپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے۔

یزید کا یہ خط پہنچا تو عبداللہ ابن عمر عازم دمشق ہوئے اور وہاں پہنچ کر یزید سے گفتگو کی۔ یزید نے عبداللہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے باپ کے ہاتھ کی تحریر پہچانتے ہو۔ عبداللہ ابن عمر نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ تب یزید نے ایک صندوق اندر سے منگوایا اور اس میں سے ایک خط نکال کر عبداللہ ابن عمر کے سامنے رکھا اور پوچھا کہ یہ تمھارے باپ کے ہاتھ کی تحریر ہے یا نہیں۔ عبداللہ نے کہا ہاں میرے باپ کی تحریر ہے اور بے شک اس پر مہر بھی میرے باپ عمر بن خطاب کی ہے۔ تب یزید نے کہا کہ اب تو اسے پڑھ لے۔ عبداللہ ابن عمر نے پڑھنا شروع کیا۔ اس خط میں لکھا تھا۔

"اے معاویہ! آگاہ ہو کہ محمدؐ نے حیلہ، بہانہ اور جادو کے ذریعہ مجھے لات و ہبل

Presented by www.ziaraat.com

کی پرستش اور عبادت سے روکا اور محمد کا جادو، موسیٰ کے جادو سے زیادہ کارگر تھا۔ لیکن ہم اپنے سابقہ دین پر قائم ہیں۔ ہمارے دل سے لات ومنات وغیرہ کی محبت ہرگز نہیں گئی اور نہ کبھی جائے گی۔ محمدؐ نے جب دنیا سے رحلت کی تو میں نے اپنی تدبیروں کو بروئے کار لاکر اپنے قبیلے کی مدد سے اسلام کی زمین کو روند ڈالا، اور علیؑ کے خلاف چالیس آدمیوں کو جھوٹی گواہی پر مامور کیا کہ محمدؐ فرما گئے تھے کہ خلیفہ قریش سے ہوگا۔ اس طرح خلافت ہم نے علی کے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اگرچہ ظاہرہ طور پر پیغمبر کی متابعت کرتا رہا مگر میرا باطن آج بھی وہی ہے جو قبل اسلام تھا۔ اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے اولاد محمدؐ کی ایذا رسانی میں کوئی رعایت یا کمی نہیں کی اور جب تک زندہ رہوں گا کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

اے معاویہ! میری یہ نصیحت تجھ کو ہے کہ آل رسولؐ کو جہاں تک ہو سکے ذلیل و رسوا اور تباہ و برباد کرنا اور خاندانِ رسالت میں سے کسی بھی فرد کو زندہ نہ چھوڑنا اور امکانی کوشش اس بات کی کرنا کہ آل رسول کسی بھی حالت میں قوت نہ پکڑنے پائیں۔ لیکن خبردار ظاہر میں مسلمان بنے رہنا تاکہ لوگ تجھ پر خروج نہ کر سکیں اور میرے اس خط کو مکمل راز میں رکھنا۔

والسلام

عمر بن الخطاب

(خلعت فلاتلم ص ۲۵۵، انوار النعمانیہ ج ۱ ص ۲۱، ثبوت خلافت دوم ص ۱۰۲)

اس عمری نوشتہ کی تمام باتیں واضح ہیں۔ کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا خط

جنگ صفین کی معرکہ آرائی سے کچھ پہلے محمد بن ابو بکر نے ایک خط معاویہ کو

لکھا اور اس میں آگاہی دی کہ خلفاء نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کے حقوق کو غصب کیا اور اب تو بھی ضلالت و گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ عنقریب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق اور عاقبت کن لوگوں کے ساتھ ہے۔

جواب میں معاویہ نے محمد بن ابو بکر کو لکھا کہ خلفاء علیؑ کے حقوق سے اچھی طرح آگاہ تھے لیکن تمہارے باپ ابو بکر اور فاروق (عمر) نے باہم اتفاق کر کے علیؑ سے ان کے حق کو چھین لیا، بس تو مجھے کیا نصیحت کرتا ہے جبکہ تیرے باپ بن قحافہ نے استبدادی طور پر اس کی ابتدا کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب اس فعل میں تیرے باپ کے ساتھ شریک تھے۔ اگر تیرا باپ عمر کے ساتھ مل کر ایسا فعل زشت نہ کرتا اور وہ علیؑ کا مطیع رہتا تو ہم بھی مطیع رہتے اور خاندان رسالت کی مخالفت نہ کرتے۔ اس صورت میں اسلام اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہتا مگر اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا ہم سب لوگوں کو منظور نہ تھا۔ (تاریخ کامل، ج ۶ ص ۹۷)

معاویہ کے اس جواب سے حسب ذیل باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ خلفاء حقوق علیؑ سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

۲۔ ابو بکر اور عمر نے باہم اتفاق اور سازش کے ذریعہ حقوق علیؑ کو غصب کیا۔

۳۔ ابو بکر و عمر کی اس سازش میں معاویہ بھی شریک تھا۔

۴۔ اگر خلفاء علیؑ کی مخالفت میں صف آرا نہ ہوتے تو اسلام اپنے سچے مرکز پر قائم رہتا۔

۵۔ اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا معاویہ یا خلفاء کو منظور نہ تھا۔

بت پرستی

مکہ کے بت پرستوں میں حضرت عمر کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ چنانچہ آپ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد بھی انتہائی مستقل مزاجی سے اپنے اس مسلک پر

Presented by www.ziaraat.com

قائم رہے۔ بخاری کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے گھر میں مورتیاں نصب تھیں اور لات وہبل کے مرقعے آراستہ رہتے تھے جس کی وجہ سے باایمان لوگ ان کے ہاتھ کی کوئی چیز یا کھانا وغیرہ کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود ان کے گھر میں یہ منظر دیکھ کر بغیر کھانا کھائے ہوئے واپس آئے اور یہی واقعہ ابوایوب انصاری کے ساتھ پیش آیا۔ (صحیح بخاری پارہ ۲۳ ص ۷۲)

حضرت عمر اور عقد ام کلثوم

کتاب اپنی معینہ ضخامت کی منزل میں پہنچ چکی ہے۔ حضرت عمر کے باقی حالات، عثمانی زندگی کا تاریخی عکس اور مولانا ندوی کی معترضہ باتوں کے مسکت جوابات کے لیے الخلفاء حصہ دوم کا مطالعہ فرمائیں جو انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے۔ آخر میں حق کی طرف سے باطل کے لعنت زدہ چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ اور سہی تاکہ دوسرے حصہ کی اشاعت تک (پنجے کا) نشان برقرار رہے۔

مولانا ندوی کا کہنا ہے کہ:۔

"حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمر کی زوجیت میں دے دیا تھا اور یہ دلیل ہے کہ وہ کتنی عزت حضرت عمر کی دل میں رکھتے تھے اور ان کا آپس میں کس درجہ ارتباط تھا۔"

(المرتضیٰ ص ۱۷۶)

حضرت عمر کے خطاکار اور گناہ آلود دامن پر آل رسول کی عداوت اور دشمنی کے جو بدنما داغ اور غیر فانی دھبے ہیں انھیں مٹانے کی کوششیں عہد معاویہ سے مسلسل جاری ہیں اور انھیں غیر اصولی کوششوں کے نتیجہ میں لاتعداد و بے شمار غلط روایتیں اور باطل حدیثیں عالم وجود میں آئیں جن کی نہ کوئی حقیقت ہے اور

نہ ہی وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ انھیں غلط روایتوں میں سے ایک روایت عقد ام کلثوم کی بھی ہے جو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے عمر کی قربت و قرابت کا رشتہ جوڑنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔

حالانکہ اس مہمل روایت کی تردید میں شیعوں کی طرف سے متعدد رسائل اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو بہ اعتبار دلائل ایسی مستحکم ہیں کہ جن کا جواب ممکن نہیں ہے مثلاً مرزا احمد کامل صاحب کی کتاب نزہتہ اثنا عشری، سید علی اظہر صاحب کا رسالہ کنز مکتوم، سید سجاد حسین صاحب کی شرح کنز مکتوم، برکات حسین صاحب سجادہ نشین مارہرہ کی کتاب قول موثوق بہ ثبوت عقد ام کلثوم اور عبدالکریم مشتاق کی کتاب افسانۂ عقد کلثوم وغیرہ۔

ان سب کتابوں میں عقد ام کلثوم کے موضوع پر مسکت اور مدلل بحث موجود ہے مگر اس کے باوجود کچھ نافہم لوگ ضد کی فصیل پر بیٹھ کر اس عقد مفروضہ کی خوشی میں جہالت کی شہنائی پر ایک فرسودہ روایت کا گیت الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو ان کی بے وقوفی کا بین ثبوت ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اسی موضوعہ اور بے ہودہ روایت کے زیر اثر خوش فہمی اور خوش فریبی کا شکار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اصل واقعہ صرف یہ ہے کہ اسماء بنت عمیس اولاً جناب جعفر طیارؑ کے عقد میں تھیں۔ اس کے بعد وہ حضرت ابوبکر کے عقد میں آئیں اور ابوبکر کے صلب سے ایک لڑکی ام کلثوم پیدا ہوئی۔ ابوبکر کے بعد اسماء کا عقد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ہوا اور ام کلثوم جو اس وقت آغوش مادر میں تھیں اپنی ماں کے ہمراہ حضرت علیؑ کی کفالت میں آگئیں۔ اور انھیں کے گھر میں رہنے لگیں۔ جیساکہ بوارق کے مصنف نے اس واقعہ کو بحوالۂ کنز العمال اور استیعاب تحریر فرمایا ہے کہ:۔ ام کلثوم دختر ابوبکر بود

Presented by www.ziaraat.com

مادرش اسماء بنت عمیس کہ اولاً زن جعفر طیار بود باز در نکاح ابو بکر آمد، عبدالرحمن پسر و دختر ام کلثوم نام زائید، بعد ازاں بہ نکاح حضرت علی ابن ابی طالب در آمد، ام کلثوم ہمراہ مادر آمد بعدہ عمر بن خطاب باام کلثوم دختر ابو بکر نکاح کرد"۔

لیکن حضرت عائشہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی بہن حضرت علیؑ کے زیر سایہ پروان چڑھے اس لیے جب ام کلثوم کی عمر چار پانچ برس کی ہو گئی تو انھوں نے خلیفہ وقت حضرت عمر سے رابطہ قائم کیا اور حکومت کی طاقت کا سہارا لے کر عمر کے ذریعہ ام کلثوم کا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؑ معاملات کی نزاکت اور سنگینی سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ام کلثوم کی کمسنی کا معقول عذر پیش کر کے پہلے تو انکار کیا لیکن حکومت کے دباؤ اور عائشہ کی سابقہ طینت کے تحت یہ سوچ کر کہ حضرت عائشہ ابو بکر کی ہمہ صفات بیٹی اور ام کلثوم کی مختلف البطن بہن اور وارث ہیں، ام کلثوم کو ان کی درخواست پر ان کے پاس بھیج دیا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت عائشہ کے کردار نے اپنی اس کم سن بہن کو بنا سنوار کر، ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کھوسٹ کے پاس اس کی بوالہوسی کا نشانہ بننے کے لیے محل خلافت میں بغیر عقد کے پہنچا دیا حضرت عائشہ کے اس طرز عمل پر پردہ ڈالتے ہوئے ابتدائی دور کے ضمیر فروش محدثین اور مورخین نے اس افسوس ناک اور عبرت انگیز واقعہ کو روایت کا لباس پہنا کر، عقد ام کلثوم پر محمول کر کے عائشہ کی غلطیوں کو مولائے کائنات کی ذات گرامی سے منسوب کر دیا، تاکہ حضرت علیؑ سے عمر کی قرابت بھی ثابت ہو جائے اور حضرت عائشہ پر کوئی الزام بھی نہ آسکے۔

چونکہ یہ روایت کثرت اور تواتر سے کتابوں میں مرقوم ہوئی ہے اس لیے اس کا تنقیدی جائزہ بھی ضروری ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کتابوں کے مصنف کون تھے؟ اور مذکورہ روایت کے راویوں کی حیثیت کیا تھی؟ چند کتابوں کے اقتباسات

ملاحظہ ہوں:۔

(۱) حضرت عمر نے حضرت علیؑ سے ان کی دختر ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا، حضرت علیؑ نے فرمایا وہ ابھی کم سن ہے۔ پس عمر نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم ایسا نہیں ہے بلکہ آپ مجھ کو رشتہ دینا نہیں چاہتے۔ اگر وہ کم سن ہے تو بھی آپ اس کو میرے پاس بھیج دیں۔ پس حضرت علیؑ نے ام کلثوم کو بلایا اور ایک پوشاک دی اور فرمایا کہ اس کو عمر کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ پوشاک کیسی ہے؟ ام کلثوم جب پوشاک لے کر آئیں تو عمر نے ام کلثوم کو بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ام کلثوم نے کہا کہ میرا بازو چھوڑ دو۔ عمر نے چھوڑ دیا اور کہا کہ کتنی حسین اور کتنی خوبصورت ہے پھر علیؑ نے ام کلثوم کی شادی عمر سے کر دی۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۱۶۸)

اس واقعہ کو ابن اسحاق نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے، ابن اسحاق کے بارے میں یحیٰ قطان نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق" کذاب ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق دجال ہے"۔ سلیمان تمیمی نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق جھوٹا ہے"۔ دارالقطنی نے کہا ہے کہ ناقابل توجہ ہے۔

(۲) عمر نے حضرت علی سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی بچی ہے۔ عمر نے کہا کہ میری اس سے شادی کر دیں میں اس کے ذریعہ فضیلت چاہتا ہوں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں تم اس کو پسند کر کے یہ سمجھ لینا کہ میں نے اس کی شادی تم سے کر دی ہے۔ پس حضرت علیؑ نے اس کو ایک چادر دے کر بھیجا اور کہا کہ اس سے کہنا کہ یہی وہ چادر ہے جسے تم طلب کر رہے تھے۔ ام کلثوم نے جا کر عمر سے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا کہ میں نے اسے پسند کر لی اور بے تابانہ ام کلثوم کی پنڈلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھول دیا۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو اس بدتمیزی پر میں

Presented by www.ziaraat.com

تمھاری ناک توڑ دیتی پھر ام کلثوم واپس گئیں اور عمر مہاجرین کی محفل میں آئے اور کہا کہ مجھے تم لوگ مبارک باد دو، کہا کس لیے، کہا میں نے ام کلثوم بنت علیؑ سے شادی کرلی (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۷)

اس کو ابو عمرو نے زبیر بن بکار سے روایت کیا ہے، اور زبیر بن بکار کے متعلق میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۴۰ میں ہے کہ اس کی حدیثیں و روایتیں ناقابل قبول ہیں کیونکہ یہ جھوٹی حدیثیں اور روایتیں وضع کرتا تھا۔

(۳) عمر بن خطاب نے جب حضرت علی سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی کم سن اور صغیرہ ہے۔ حضرت عمر کو بتایا گیا کہ علیؑ نے رشتہ دینے سے انکار کیا ہے۔ پس انھوں نے پھر طلب کیا تو حضرت علیؑ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا، اگر وہ تم کو پسند آگئی تو وہ تمھاری بیوی ہوگی۔ علیؑ نے ام کلثوم کو بھیج دیا۔ عمر نے ان کی پنڈلی کھولی۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تو خلیفہ نہ ہوتا تو میں تیرے منھ پر تھپڑ مارتی۔" (اصابہ ج ۲ ص ۴۶۲)

اس روایت کو سفیان نے عمر بن دینار سے روایت کیا ہے۔ امام احمد کا کہنا ہے کہ ابن دینار ضعیف ہے اور امام نسائی اور مرّہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے
(میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۷)

(۴) عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے ان کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا۔ علیؑ نے جواب دیا کہ وہ ابھی بچی ہے۔ عمر نے کہا خدا کی قسم ایسی بات نہیں۔ مگر مجھے علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ پس علیؑ نے حکم دیا اور بچی کو سجایا سنوارا گیا اور ایک چادر اس کو اوڑھائی گئی اور آپ نے کہا کہ جاکر خلیفہ سے کہنا کہ اگر یہ چادر آپ کو پسند آئے تو رکھ لیں ورنہ واپس کر دیں۔ وہ بچی آئی تو عمر نے کہا اللہ تجھ میں برکت کرے تو مجھے پسند ہے۔ بس وہ علیؑ کے پاس واپس گئی اور

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMAT
MAYOTTE

عمر کا فیصلہ سنایا۔ علیؑ نے اس کی شادی عمر سے کر دی اس سے ایک لڑکا زید پیدا ہوا۔" (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۴۶۴)

اس روایت کو ابن سعد نے محمد بن عمر واقدی سے حاصل کیا ہے۔ امام نسائی کا کہنا ہے کہ واقدی کذاب ہے اور بغداد میں اپنی کذب بیانی کی وجہ سے مشہور تھا (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶) امام بخاری کا کہنا ہے کہ واقدی متروک الحدیث ہے۔ مرّہ نے کہا ہے کہ واقدی کوئی چیز نہیں ہے۔ یحیٰ ابن معین نے کہا ہے کہ واقدی ضعیف ہے۔ ابن مدائنی کا قول ہے کہ واقدی کی بیس ہزار حدیثیں مہمل اور غلط ہیں۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ ابن سعد نے انس بن عیاض، عمار بن ابی عامر، ابو حصین اور ابو خالد اسماعیل وغیرہ سے بھی روایت کی ہیں۔ میزان الاعتدال میں ان تمام راویوں کو مجہول الحال قرار دیا گیا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۹۵)

اسی طرح ہشام بن سعد بھی راوی ہے جسے نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۵۴) اسماعیل بن عبدالرحمٰن اسدی کو یحیٰ بن معین نے ضعیف لکھا ہے اور لیث نے کاذب قرار دیا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۰) عطا بن مسلم خراسانی کو بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی حدیث سے احتجاج باطل ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۹) عبیداللہ بن موسیٰ کو امام احمد بن حنبل نے صاحب تخلیط کہا ہے اس کی حدیثیں بد ترین ہیں (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰) عبدالرحمٰن بن زید کو امام نسائی نے ضعیف کہا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۰۵) اسی طرح ابن شہاب زہری کا ناصبی اور دشمن علیؑ ہونا مشہور ہے۔
الغرض یہ واقعہ ایسے ناقابل اعتبار راویوں پر انحصار کرتا ہے جن کی حیثیت علم رجال کے دائرے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

Presented by www.ziaraat.com

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

سبط ابن جوزی اس شرمناک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نانا نے کتاب المنتظم میں اس کا ذکر کیا ہے کہ علیؑ نے ام کلثوم کو عمر کے پاس بھیجا تھا کہ وہ انھیں دیکھیں اور عمر نے ان کی پنڈلی کھول دی۔ انھیں ہاتھ سے چھوا۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم یہ بدترین بات ہے۔ اگر یہاں کوئی کنیز بھی ہوتی تو عمر اس سے یہ بدسلوکی نہ کرتے کیونکہ اجنبی عورت کو مس کرنا حرام ہے۔ لہٰذا یہ بات حضرت عمر کی طرف کیسے منسوب کی جائے۔

اہل سنت کی صحاح ستہ میں اس نکاح کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ یہ کتابیں حضرت عمر کے جھوٹے فضائل اور مناقب سے بھری پڑی ہیں۔ متذکرہ بالا روایات کو اگر تنقید کی نظروں سے دیکھا جائے تو ہر تعلیم یافتہ ذہن حسب ذیل نتائج کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

(الف) حضرت عمر ساٹھ سال کی عمر میں ایک کم سن اور بروایتے صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی سے عقد کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور حضرت علی عذر پیش کرتے ہیں کہ بچی شادی کے قابل نہیں ہے۔ مگر حضرت عمر اپنی حکومت کے زعم میں حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلاتے ہیں اور خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جو تمھارے دل میں ہے اس سے میں واقف ہوں۔ یہاں قسم کھا کر حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلایا جاتا ہے جبکہ مولانا ندوی کی نظر میں دونوں بزرگ ایک دوسرے پر کامل بھروسا کرتے تھے۔

(ب) اس شادی کی تعجب خیز نوعیت یہ ہے کہ عقد کے لیے نہ کوئی محفل منعقد ہوئی اور نہ اکابرین صحابہ مہاجرین و انصار میں سے کسی کو مدعو کیا گیا، نہ کسی کو خبر ہو سکی۔ بلکہ اصول اور رسم و رواج کے خلاف لڑکی کا باپ اس پر آمادہ ہے کہ میں اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمھاری بیوی ہے (لاحول ولا قوۃ)

(ج) یہ پہلو کس قدر شرمناک ہے کہ ایک اسلامی خلیفہ اور صحابی رسولؐ، غیر شرعی طور پر ایک نامحرم، نابالغ اور کم سن بچی سے دست درازی کرتا ہے۔ اسے اپنے سینے سے چمٹاتا ہے، بازو پکڑ کر کھینچتا ہے، پنڈلی کھولتا ہے اور بوس و کنار کرتا ہے اور وہ بچی اپنی آبرو کو خطرے میں محسوس کر کے یہ کہتی ہے کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو میں تمھاری ناک توڑ دیتی۔

(د) اگر ان روایات کو درست مان لیا جائے تو یہ اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ حضرت عمر نے ساٹھ برس کی عمر میں ایک نامحرم اور نابالغ و کم سن بچی پر مجرمانہ حملہ کیا، اور اگر عمر کی جگہ کوئی دوسرا شخص اس بے حیائی اور بے غیرتی کے ساتھ اس جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کو عبرت ناک سزا کا سامنا کرنا پڑتا مگر چونکہ خود حاکم وقت نے یہ قدم اٹھایا تھا اس لیے تمام تعزیری کارروائیاں ساکت اور خاموش رہیں۔ ان روایات سے حضرت عمر کا صریحاً ظالم، فاسق و فاجر ہونا ثابت ہے۔

(ھ) مذکورہ روایت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اس نکاح کو صحابۂ رسول سے مخفی رکھا گیا۔ ان کو اس عقد کی خبر تک نہ ہوئی اور جب ام کلثوم ناراض ہو کر واپس چلی گئیں تو حضرت عمر نے مبارک باد کا مطالبہ کیا۔ جب صحابہ نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے ام کلثوم سے شادی کی خبر دی۔ حلبی نے تو شرافت کے بخیے تک ادھیڑ کر رکھ دیے، یہاں تک لکھ دیا کہ "حضرت عمر نے مہاجرین کی مجلس میں جا کر یہ کہا کہ مجھے مجامعت کرائیے۔ صحابہ نے پوچھا، کس سے؟ تو آپ نے کہا کہ میں نے ام کلثوم سے شادی کر لی ہے۔" (کتاب السیرت ص ۴۶۳)

ان تمام باتوں کے علاوہ اہل سنت والجماعت کے مذاہب اربعہ میں از روئے فقہ اس فرضی عقد کی تردید کر کے اسے باطل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے مطابق دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نکاح باطل

Presented by www.ziaraat.com

ASSOCIATION KHOJA SHIA ITHNA ASHERI JAMAT

اور شریعت اسلامیہ کی نفی میں ہے۔ کیونکہ عقد مفروضہ میں ایجاب و قبول واقع نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں گواہان مقرر کیے گئے۔ اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایجاب و قبول نکاح کا رکن ہے کسی مسلمان کا نکاح بغیر دو عادل آزاد اور بالغ مسلمانوں کی شہادت کے منعقد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس نکاح میں یہ تمام شرائط مفقود ہیں اس لیے یہ نکاح قطعی باطل اور غیر اسلامی قرار پاتا ہے۔

روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر کے سخت اور جابرانہ مطالبہ کے بعد لڑکی کے ولی نے یہ فرمایا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیجوں گا اگر تم کو پسند آ گئی تو اس کی شادی تم سے کر دوں گا۔ (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۷) یا یہ کہا کہ "اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمھاری بیوی ہے۔" (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۹)

"اگر" کے لفظ پر منحصر عقد اصطلاح کی زبان میں عقد معلق کہلاتا ہے اور مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں یا حنفیوں کے نزدیک نکاح معلق باطل ہے۔ نکاح کو منجز ہونا چاہیے۔

روایت سے یہ بات بھی آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ام کلثوم اس وقت کم سن اور نابالغ تھیں۔ نابالغ بچی کی رسم نکاح میں ایک وکیل اور ایک گواہ کا ہونا کافی ہے لیکن حنفی مسلک کے مطابق باپ کی موجودگی شرط ہے اگر باپ موجود نہیں ہے تو نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ام کلثوم کی عمر اس نکاح کے وقت دس گیارہ برس کی تھی تو یہ مفروضہ اور بھی خطرناک ہو گا کیونکہ روایتیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ ام کلثوم سے حضرت عمر کے ساتھ عقد کرنے کی کوئی اجازت لی گئی ہو۔ بلکہ حضرت عمر کی دست درازی کے بعد انھیں بتایا جاتا ہے کہ وہ تمھارا شوہر ہے۔ (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۷) یعنی حضرت عمر کی بدتمیزی سے قبل لڑکی کو کچھ نہیں معلوم۔ جب کہ اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ حرہ، بالغہ

اور عاقلہ کا نکاح اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اور نہ ہی کسی ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ بالغہ اور ناکتخدا کو کسی شخص سے نکاح پر مجبور کرے۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں نکاح باطل قرار پاتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ نکاح کو برسر عام کرو تا کہ حرام و حلال کا فرق معلوم ہو سکے۔ خود حضرت عمر کا قول ہے کہ نکاح کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کا اعلان کیا جائے۔ حضرت عمر کے دوسرے نکاح بھی برسر عام ہوئے اور کسی صحابی نے بھی چوری چھپے نکاح نہیں کیا۔

ابن سعد کی طبقات اور دیگر کتابوں میں مرقوم ہے کہ ام کلثوم کا مہر چالیس ہزار درہم مقرر ہوا۔ مہر شرعی کی یہ رقم خود حضرت عمر کے اپنے ہی قول کے خلاف ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ حق مہر زیادہ نہ ہو کیونکہ رسول اللہ (صلعم) نے اپنی کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔ (ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۱۲) شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ "حق مہر کا بڑھانا خلاف اصول پیغمبرؐ ہے، چونکہ صحیح احادیث میں حق مہر بڑھانے کی ممانعت ہے اس لیے حق مہر آسان باندھو۔"

(تحفہ اثنا عشری ص ۵۹۱ فارسی)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اسی حق مہر یعنی چالیس ہزار درہم کا ذکر اپنی کتاب الفاروق کے صفحہ ۵۰۰ پر کیا ہے جو شریعت اسلامی اور خود اصول عمری کے خلاف ہے کیونکہ حضرت عمر دوسروں کو تو زیادہ مہر سے روکتے تھے اور خود ساٹھ سال کی عمر میں ایک نابالغ اور کم سن دلھن کا چالیس ہزار درہم مہر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

زیر بحث روایت سے یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ ۱۷ھ میں حضرت عمر سے اس فرضی شادی کے وقت ام کلثوم کی عمر صرف چار یا پانچ سال کی تھی۔ بعض مورخین کے نزدیک صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی تھیں یا صغیرہ و نابالغہ تھیں۔ ابن حجر کی صواعق

Presented by www.ziaraat.com

محرقہ میں ہے کہ وہ بہت چھوٹی تھیں ورنہ حضرت علیؑ ان کو عمر کے پاس نہ بھیجتے۔ شہاب الدین دولت آبادی کے نزدیک ان کی عمر پانچ برس کی تھی۔ یاسین موصلی نے المہذب ص ۹۸ پر اور عمر رضا کحالہ نے اعلام النسا ص ۲۵۶ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر نے ذیقعد ۱۸ھ میں یہ شادی کی اور شادی کے ایک سال بعد دخول کیا حالانکہ نابالغ بچی سے دخول فعل حرام ہے خواہ وہ منکوحہ ہی کیوں نہ ہو لہذا عمر رضا کحالہ کی نظروں میں حضرت عمر فعل حرام کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنے بیان کے اثبات میں دو شیعہ علماء قاضی نوراللہ شوستری اور ابوالقاسم قمی کی کتابوں کو دلیل قرار دے کر عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جو سعی فرمائی ہے وہ انتہائی مذموم ہے اور اس سے ان کی تاریخی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے۔

قاضی نوراللہ شوستری شہید ثالث کا بیان اس نکاح کی تردید میں ہے اور "اگر" سے مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی احتمال خطا کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ حضرت عمر کلمہ گو تھے اور شیخ قمی نے اس واقعہ کو صرف کتابوں میں لکھا ہونا بیان کیا ہے نہ کہ انھوں نے تائید فرمائی ہے۔

میرا یہ مشورہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے بجائے ندوی صاحب ایک بار پھر شہید ثالث اور شیخ قمی کی روایتوں پر غور فرمائیں اور اگر آپ کو شیعہ علماء کی تحقیق پر بھروسا ہے تو ابو محمد بن شاذان بن خلیل نیشاپوری کی تحقیق پر غور فرمائیں۔ جو جلیل القدر فقہا و ثقہ اور متکلمین میں سے ہیں اور آپ امام رضا علیہ السّلام، امام محمد تقی علیہ السّلام، امام علی نقی علیہ السّلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے معتمد صحابی تھے اور اہل سنت نے بھی آپ کو معتمد علیہ تسلیم کیا ہے۔

ابو محمد علیہ الرحمہ نے اس عقد کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے ہیں ان

سے اس واقعہ کی تردید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :- "لوگوں نے غلط طور پر یہ وہم کر لیا ہے کہ عمر نے ام کلثوم الکبریٰ بنت امیر المومنین کا رشتہ طلب کیا بلکہ انھوں نے تو ام کلثوم بنت جرول خزاعیہ سے نکاح کیا تھا۔ (تاریخ قم حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری قمی معاصر شیخ صدوق ص ۱۹۳)

اس مفروضہ روایت کے سلسلے میں سرکار علامہ شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ :-

یہ روایت جو وارد ہوئی ہے کہ جناب امیر المومنین نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت عمر سے کر دی تھی، بالکل ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا راوی زبیر بن بکار ہے جس کے لیے مشہور ہے کہ یہ ناقابل اعتماد اور متہم ہے۔ چونکہ یہ حضرت علی کا دشمن تھا اس لیے ان کے خلاف غلط روایتیں وضع کرتا رہتا تھا۔ شیعہ کتابوں میں یہ روایت اس لیے نقل ہو گئی ہے کہ ابو محمد یحیٰ ابن حسن علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں اس کو لکھ دیا اور لوگوں نے علوی سمجھ کر اس پر اعتماد کر لیا۔ حالانکہ انھوں نے یہ روایت زبیر بن بکار سے لی ہے اور یہ روایت بہ ذات خود بھی مختلف طریقوں سے نقل ہوئی ہے۔ زبیر بن بکار کبھی یہ نقل کرتا ہے کہ امیر المومنین نے خود اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔ کبھی روایت کرتا ہے کہ عباس کو اس عقد کا متولی بنایا، کبھی کہتا ہے کہ اختیار و ایثار پر یہ نکاح ہوا۔ پھر بعض نے اس روایت کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ حضرت عمر سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام زید ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زید بن عمر لاولد مر گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی بھی اولاد ہے۔ کئی کہتے ہیں کہ یہ اور اس کی ماں دونوں قتل کر دیے گئے، کسی نے کہا کہ ماں بعد میں بھی زندہ رہی کوئی کہتا ہے کہ عمر نے چالیس ہزار درہم حق مہر مقرر کیا، کوئی کہتا ہے کہ چار سو درہم پر نکاح ہوا، کسی نے کہا پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔ اس قول کی ابتدا اور اس واقعہ

Presented by www.ziaraat.com

میں اختلاف کی کثرت اصل روایت کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

(المسائل السرویہ ص ۱۶۱ المسئلۃ العاشرہ مطبوعہ نجف اشرف)

اسی طرح شیعہ علمائے کرام کی طرف سے لاتعداد کتابیں اس نکاح کی تردید میں موجود ہیں جو اس کی روایت مفروضہ کو باطل قرار دیتی ہیں۔ ضروری ہے کہ اس واقعہ کی تاریخی خامیوں کو بھی اجاگر کیا جائے تاکہ اس مسئلہ پر مزید بحث کی گنجائش نہ رہ جائے۔ مورخین کی اکثریت نے اس عقد کو ذیقعد سنہ ۱۷ھ میں ہونا بیان کیا ہے۔ اسی سال حضرت زینبؑ بنت علی علیہ السلام کا عقد عبداللہ بن جعفر سے ہوا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بڑی بیٹی کی موجودگی میں چھوٹی دختر کا نکاح پہلے کیوں کیا گیا؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تاریخ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ام کلثوم اور ان کے صاحبزادے زید جن کی عمر بیس سال کی تھی کا انتقال ایک ہی وقت میں ہوا، امام حسنؑ نے عبداللہ بن عمر کو نماز جنازہ پڑھنے کو کہا جب کہ ام کلثوم سنہ ۶۱ھ میں واقعہ کربلا کے بعد اسیران کے قافلہ میں شامل تھیں اور عبداللہ بن عمر کا یزیدی حکومت پر اثر و رسوخ بھی تھا۔ یہاں تک کہ جناب مختارؒ کو انھیں عبداللہ ہی کی سفارش پر رہا کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اعلانیہ بنی امیہ کے جانی دشمن تھے۔ مگر عبداللہ نے اپنی سوتیلی ماں کی سفارش نہیں کی۔ اگر ام کلثوم عبداللہ کی سوتیلی ماں ہوتیں تو وہ یقیناً اپنی غیرت اور باپ کی عزت کو بازاروں میں در بدر نہ ہونے دیتے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ مورخین کا کہنا ہے کہ عمر کے مرجانے کے بعد ام کلثوم کا عقد ثانی عون بن جعفر سے ہوا۔ حالانکہ شیعہ روایتوں کے مطابق حضرت زینب اور ام کلثوم کا عقد ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں عبداللہ اور عون پسران جعفر سے ہوا۔ عمر کے مرنے کے بعد بنت ابوبکر کا عقد عون بن جعفر سے اس لیے ناقابل تسلیم ہے کہ عون حضرت عمر کی زندگی ہی میں جنگ فارس میں کام آچکے تھے۔

تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے علاوہ ام کلثوم نام کی چار بیویاں اور بھی تھیں۔

۱۔ ام کلثوم جمیلہ بنت عاصم بن ثابت، جو عاصم بن عمر کی ماں تھیں۔

(تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۵۱)

۲۔ ام کلثوم بنت جرول خزاعی، ان کا اصل نام ملیکہ تھا۔ یہ زید بن عمرو کی ماں تھیں۔ (کامل ج ۳ ص ۲۲)

۳۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط۔

(یہ زمانۂ جاہلیت میں عمرو بن عاص کے پاس سے بھاگ کر آئی تھیں اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قرابت داروں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو عورت اسلام قبول کر لے وہ کسی کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی لہذا واپس نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس سے نکاح کر لیا۔ (تفسیر کبیر ج ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۴ ص ۳۴۹)

۴۔ ام کلثوم بنت راہب (سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد)

بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے لیے حضرت عمر نے حضرت عائشہ کے پاس عقد کا پیغام بھیجا تھا اور وہ راضی ہوگئی تھیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل حوالہ جات سے ثابت ہے۔

(۱) تاریخ خمیس، علامہ حسین دیار بکری ج ۲ ص ۲۶۷ (۲) تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۱ مطبوعہ مصر (۳) الاستیعاب ج ۲ ص ۹۵، وغیرہ

ان تمام شواہد اور تاریخی تجزیہ کے بعد معمولی عقل کا انسان بھی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ روایت محض حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی تحقیر کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اس نکاح سے نہ حضرت عمر کی فضیلت میں کوئی

Presented by www.ziaraat.com

اضافہ ہوتا ہے اور نہ اسلام کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ عمری کردار سیاہ اور اسلامی تعلیمات مکروہ دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا ندوی کی عقدام کلثوم پر مبنی معترضہ تحریر کے اس جواب کے بعد الخلفاء کا حصہ اول تمام ہوا۔ باقی جوابات حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں اور میری ذاتی درخواست پر میرے والد مرحوم کے لیے ایک سورہ فاتحہ ارسال فرمائیں

شکریہ

شیعیت زندہ باد... حُسینیت پائندہ باد... یزیدیت مردہ باد

خادم ملّت

فروغ کاظمی

کتاب کے مآخذ

(بہ اعتبار حروف ابجدی)

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۱	قرآن مجید	۱۵	انوار النعمانیہ
۲	نہج البلاغہ	۱۶	انوار اللغۃ
۳	احیاء العلوم	۱۷	المہذب (یاسین موصلی)
۴	ارجح المطالب	۱۸	اعلام النساء (عمر رضا کحالہ)
۵	ازالۃ الخفاء	۱۹	المسئلۃ العاشرہ
۶	اصحاب ثلاثہ	۲۰	جامع ترمذی
۷	استیعاب	۲۱	جامع الاصول
۸	اسد الغابہ	۲۲	جہاد حسین
۹	الفاروق	۲۳	چودہ ستارے
۱۰	الوافی	۲۴	در منشور
۱۱	امہات الامہ	۲۵	ہدایت السعداء
۱۲	الامامت والسیاست	۲۶	حیواۃ الحیوان
۱۳	اصابہ	۲۷	حبیب السیر
۱۴	انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ملقب بہ سیرت	۲۸	طبقات ابن سعد
		۲۹	کنز العمال

Presented by www.ziaraat.com

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۳۰	کنز العمال	۴۹	نزول الابرار
۳۱	کتاب الفتن	۵۰	ینابیع المودة
۳۲	کوکب دری	۵۱	نور ایمان
۳۳	کتاب البشائر المصطفےٰ	۵۲	نہایہ ابن اسیر
۳۴	کتاب السیرت	۵۳	سیرة النبی (علامہ شبلی نعمانی)
۳۵	لغات کشوری	۵۴	سنن ابی داؤد
۳۶	مستدرک حاکم	۵۵	سوانح عمری حضرت ابو بکر (محمد حسین ہیکل)
۳۷	مروج الذہب		
۳۸	میزان الکبریٰ	۵۶	سوانح عمری حضرت ابو بکر (عبد الرحمٰن)
۳۹	مدارج النبوة	۵۷	سیرة النبی (ابو محمد بن عبد الملک)
۴۰	مسند امام حنبل	۵۸	سیرة العلویہ
۴۱	مشکوٰة شریف	۵۹	سیرة محمدیہ
۴۲	مواہب	۶۰	سیرة حلبیہ
۴۳	ماہنامہ منادی	۶۱	سر العالمین
۴۴	معارف	۶۲	سیرة ابن ہشام
۴۵	مشکوٰة المصابیح	۶۳	سیرة الخلفاء
۴۶	مطالب السؤل فی مناقب آل رسول	۶۴	سنن ابن ماجہ
۴۷	مفتاح الفتوح	۶۵	عقد الفرید
۴۸	میزان الاعتدال	۶۶	عمر فاروق اعظم (مترجم حبیب اشعر لاہور)

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۶۷	عمدة المطالب	۸۶	شفاء (قاضی عیاض الدین)
۶۸	فتح الباری فی شرح بخاری	۸۷	شرح زرقانی
۶۹	فردوس الاخبار	۸۸	شواہد النبوة
۷۰	فصول المہمہ	۸۹	شرح مسلم (نووی)
۷۱	فتاوائے عزیزی	۹۰	تاریخ کامل
۷۲	صواعق محرقہ	۹۱	تاریخ طبری
۷۳	صحیح مسلم	۹۲	تفسیر در منثور
۷۴	صحیح بخاری	۹۳	تفسیر معالم التنزیل
۷۵	صحیح ترمذی	۹۴	تحفة العباد
۷۶	قرة العینین	۹۵	تاریخ الامم والملوک
۷۷	ریاض النضرة	۹۶	تفسیر کبیر
۷۸	روض الانف	۹۷	تہذیب التہذیب (علامہ ذہبی)
۷۹	روضة الصفا	۹۸	تہذیب التہذیب (علامہ حجر عسقلانی)
۸۰	روضة الاحباب	۹۹	تاریخ خمیس
۸۱	روضة الشہدا	۱۰۰	تاریخ احمدی
۸۲	روائح المصطفےٰ	۱۰۱	تاریخ ابن اثیر
۸۳	رسالہ مولوی	۱۰۲	تاریخ ابن خلدون
۸۴	رسالہ کنز مکتوم	۱۰۳	تاریخ بغداد
۸۵	شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید	۱۰۴	تاریخ عروج وزوال سلطنت روم

Presented by www.ziaraat.com

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۱۰۵	تاریخ یعقوبی	۱۱۲	تجرید بخاری
۱۰۶	تاریخ الاعیان	۱۱۳	تذکرہ خواص الائمہ
۱۰۷	تاریخ ابو الفدا	۱۱۴	تحفۂ اثنا عشری
۱۰۸	تاریخ اسلام	۱۱۵	ثبوت خلافت اول و دوم
۱۰۹	تاریخ قم (حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری)	۱۱۶	خلفائے راشدین (مولوی عبد الشکور)
		۱۱۷	خلافت الٰہیہ
۱۱۰	تاریخ خلفاء (مولوی مسیح الدین کاکوروی)	۱۱۸	خصائص نسائی
۱۱۱	تلخیص سیرۃ النبی	۱۱۹	خلعت فلاطم

حکیم سید محمود گیلانی کی دو بیش بہا تحریریں

نبی اور علی

ہدیہ: آٹھ روپیے

ایلیا

ہدیہ
دس روپیے

ملنے کا پتہ
عباسؑ بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ

شہید محراب
آیۃ اللہ سید عبد الحسین دستغیب شیرازی
کی
دو گراں قدر تصنیف

استعاذہ

(اللہ تعالیٰ کے حضور میں پناہ طلبی)

ہدیہ =/۳۵

قلب سلیم

دونوں حصے ایک جلد میں دستیاب ہیں

ہدیہ: ستر روپئے

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی
درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ (انڈیا)
فون نمبر: ۲۶۰۷۵۶

Presented by www.ziaraat.com